یکم ستمبر ۲۰۲۶ء
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
جلد نمبر: ۱۹ ۔ شمارہ نمبر: ۱۷

پندرہ روزہ
معارف فیچر
کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر:
سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمودُالحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی
ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل ’بی‘ ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۹۲_۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

مشرقِ وسطیٰ سے امریکا کی روانگی

Marc Lynch

امریکا کا مشرقِ وسطیٰ ختم ہوا۔ امریکا نے ۱۹۹۱ء سے اب تک مشرقِ وسطیٰ میں جو سکیورٹی سیٹ اپ قائم کر رکھا تھا، اُسے ایران کے خلاف حالیہ جنگ نے ختم کر دیا۔ ایران میں حکومت کے خاتمے کی کوشش میں امریکا اور اسرائیل کی ناکامی نے عشروں سے ایران پر تھوپی جانے والی اقتصادی پابندیوں اور تشدد کے دیوالیہ پن کو ثابت کر دیا۔ امریکی فوج ایران کے حملوں سے خلیجی ریاستوں کو بچانے میں ناکام رہی ہے جس کے نتیجے میں سکیورٹی کے نام پر اِس خطے میں اُس کے اڈوں کے قیام کا جواز بھی اب فوت ہو چکا ہے۔ اسرائیل اب بھی دھمکی آمیز بیانیہ اختیار کیے ہوئے ہے جس کے نتیجے میں فلسطینیوں سے جامع اور دیرپا تصفیے کا امکان مٹی میں ملتا دکھائی دے رہا ہے۔ امریکا ایک زمانے سے، اپنے دعوے کے مطابق، فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کو ایک دوسرے کے لیے قابلِ قبول بنانے کی کوشش کر رہا ہے مگر اب یہ کوششیں مکمل طور پر ناکام دکھائی دے رہی ہیں۔

ساڑھے تین عشروں سے مشرقِ وسطیٰ میں امریکا کا بنیادی ہدف اسرائیل کا تحفظ رہا ہے جس کے لیے اپنے عرب حلیفوں کو ایک ایسے نظام کے تابع کیا جس کے تحت وہ تھوڑے سے محدود رہیں۔ وہ ایران اور عراق کو خاص طور پر محدود رکھنا چاہتا تھا۔ حالیہ چند برسوں میں امریکا نے ایران اور اُس کے غیر ریاستی حلیفوں اور پراکسیز کو ایک خاص حد میں رکھنے پر توجہ دی ہے۔ اس حکمتِ عملی سے انحراف سے مکمل گریز کرتے ہوئے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے باضابطہ جنگ کے ذریعے ایران سے حساب برابر کرنے کے لیے اسرائیل کے ساتھ مل کر اُس کے خلاف جنگ چھیڑی۔ وہ ایک ہی ہلّے میں ایران کی پوری قیادت کو ختم کر کے وہاں ایک نیا نظامِ حکومت لانا چاہتے تھے۔ امریکی قائدین نے ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملے سے قبل اور اسرائیل نے حزب اللہ اور حماس پر حملوں سے قبل یہ کہا تھا کہ بھرپور طاقت کے ذریعے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ایران کے خلاف حالیہ جنگ کی منصوبہ سازی کرنے والوں نے بھی یہی کہا کہ بھرپور طاقت بروئے کار لاکر ایران میں حکومت اور طرزِ حکومت بدلی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ایران کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا جو صورتِ حال کے مطابق خود کو بدلنے کی بھرپور صلاحیت کا حامل ہے۔ اِن منصوبہ سازوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایران کے خلاف چھیڑی جانے والی یا اُس پر مسلط کی جانے والی جنگ کے نتیجے میں شہریوں کا غیر معمولی جانی و مالی نقصان ہو سکتا ہے۔ ایران کے خلاف حالیہ جنگ کو ہر حال میں ایک یکسر غلط مہم جُوئی ہی قرار دیا جائے گا۔

طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکا کے لائے ہوئے نظام کو حالیہ ایران جنگ سے کوئی بڑا دھچکا لگا ہے۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ غیر نتیجہ خیز ایران جنگ اور اِس کے نتیجے میں مضبوط ہو کر ابھرنے والے ایران کو دیکھتے ہوئے خلیجی ریاستیں اپنی سلامتی کے بارے میں زیادہ فکرمند ہوں گی اور امریکا و یورپ سے مزید اسلحہ خریدیں گی، سلامتی کی نئی ضمانتیں چاہیں گی۔

مشرقِ وسطیٰ میں سلامتی کا جو نظام کام کرتا آرہا تھا، وہ اب ختم ہوا اور اِس کی جگہ نیا نظام آرہا ہے۔ کوئی بھی نظام راتوں رات ختم نہیں ہوتا۔ ۱۹۵۶ء میں سوئز نہر کے بحران نے برطانوی اور فرانسیسی استعماری قوت کے رخصت ہونے کی نوید دی مگر یہ سب کچھ ختم ہونے میں کئی سال لگے۔ مشرقِ وسطیٰ میں امریکا بیشتر معاملات پر متصرف رہا ہے۔ یہ تصرف راتوں رات ختم نہیں ہوگا مگر اِتنا تو اب طے ہے کہ امریکا اور اُس کے اتحادیوں کے حوالے سے اعتماد ختم ہو چلا ہے اور شکوک و شبہات خطرناک حد تک بڑھ گئے ہیں۔ علاقائی ممالک کو بھی اندازہ ہو چکا ہے کہ اب امریکا پر پورا بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ ایران جنگ اور اُس سے پہلے غزہ کی صورتِ حال نے امریکا سے متعلق سوچ بدل دی ہے۔ لڑائی کے ایک اور دور یا امریکا میں نئے صدر کے انتخاب سے معاملات کو درست کرنا ممکن نہ ہوگا۔

صاف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ آنے والے سال امریکا سے متعلق سوچ کو مزید بدلیں گے۔ مشرقِ وسطیٰ کو انتشار اور لاقانونیت کی حالت میں رکھنا اسرائیل اور ایران، دونوں کے مفاد میں ہے۔ اور امریکا اِن میں سے کسی کو بھی ایک خاص حد تک رکھنے کی زیادہ اہلیت نہیں رکھتا۔ اسرائیل اپنی سرحدوں کی توسیع پر تُلا ہوا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تاریخی فلسطینی سرزمین کو اپنی حدود میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ اسرائیل

اندرونی صفحات پر

- ترکیہ: اردوان کی آق پارٹی کے ۲۵ برس
- مکہ معاہدہ: امکانات اور خدشات
- تہذیبوں کا تصادم اور جان ایسپوزیٹو کی تنبیہ
- بھارت کی نئی اُلجھن

پورے مشرقِ وسطیٰ پر اپنا اقتدار چاہتا ہے۔ ایران میں طرزِ حکومت بدلتی دکھائی نہیں دے رہی اور اِس کا امکان بھی خاصا کمزور ہے۔ ایسے میں ایران مزید توانا ہوکر ابھرے گا۔ امریکا سے اُس کی جھڑپیں ہوتی رہی ہیں اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو معاملات ایران کے حق میں جائیں گے۔ اِس کے نتیجے میں پورے خطے میں ایران کا اثر ورسوخ بڑھے گا۔

اگر امریکا اپنی ناکام حکمتِ عملی کو مکمل طور پر ترک کرنے کا فیصلہ کر بھی لے تو ایک نظام کے خاتمے سے بہتر نظام کے قیام کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ یہ بہر حال ماننا پڑے گا کہ حالات و معاملات کسی بھی اعتبار سے بہتر نہیں۔ خطے کے لوگ چاہتے ہیں کہ انتشار ختم ہو، جھڑپیں رُکیں اور خوش حالی کی راہ ہموار ہو۔ خطے کے قائدین اِس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں امریکا تمام علاقائی ممالک کو کسی نئے تنازع اور قضیے میں نہ گھسیٹ لے۔ اگر امریکا خطے میں آمروں کا ساتھ دینے کی پالیسی ترک کردے، اپنے اتحادیوں کے مواخذے سے گریز کی راہ پر چلنا چھوڑ دے تو بہت جلد خطے میں اُس کے لیے نئے سِرے سے کچھ مثبت کرنے کی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے۔

بنیاد میں دراڑیں

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکا نے مشرقِ وسطیٰ میں جو کچھ بھی کرنا چاہا تھا، وہ سابق سوویت یونین سے اُس کی مسابقت کے ہاتھوں تشکیل پاتا تھا۔ خطے میں امریکی مفادات کو غیر معمولی وسعت اختیار کرنے کا موقع ملتا تاہم امریکا کو ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ اُسے سابق سوویت یونین کی طرف سے فوجی مداخلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مشرقِ وسطیٰ میں کم و بیش ساڑھے تین عشروں تک کام کرنے والا نظام سابق امریکی صدر جارج ہربرٹ بش نے سوویت یونین کی تحلیل اور خلیج کی جنگ (۱۹۹۰۔۱۹۹۱ء) کے نتیجے میں کویت پر عراقی قبضے کے خاتمے کے بعد قائم کیا تھا۔ اس میں امریکا کو ہر اعتبار سے اوّلیت حاصل رہی ہے۔ ایک وسیع خطے پر امریکا کو طویل مدت تک غیر معمولی تصرف حاصل رہا۔ مشرقِ وسطیٰ پر تصرف پانے کی لڑائی کئی طاقتور ریاستوں کے درمیان ہوتی رہی ہے۔ امریکا نے ایران اور عراق کو قابو میں رکھنے کے لیے پورے خطے میں اپنی مرضی کے مطابق فوجی اڈے قائم کیے۔ خطے کی کم و بیش ہر حکومت کے لیے امریکی فوج اور امریکی سیاست دان ہی فیصلے کرتے رہے۔

خطے میں اپنے تصرف کو طول دینے کے لیے امریکا نے اسرائیل اور عربوں کے درمیان پیچ اپ کرانے کی کوشش کی۔ امریکی قیادت نے کوشش کی کہ عرب ریاستیں اور اسرائیل ایک مشترکہ سکیورٹی سیٹ اپ کا حصہ بن جائیں اور کشیدگی ختم ہو۔ پھر یوں ہوا کہ ایک طرف تو امریکی بلاک تھا یعنی امریکا اور اسرائیل کے ساتھ ترکی اور کم و بیش تمام ہی عرب ریاستیں۔ اور دوسری طرف ایران، شام (جو بشارالاسد کی کمان میں تھا) اور چند غیر ریاستی دھڑے تھے جن میں حماس، حزب اللہ اور حوثی ملیشیا نمایاں تھے۔ تین عشروں کے دوران یہ سیٹ اپ عالمی، علاقائی اور امریکی سیاست میں ڈرامائی تبدیلیوں کے باوجود قائم رہا ہے۔

امریکا کا موقف یہ ہے کہ یہ سکیورٹی سیٹ اپ انسدادِ دہشت گردی اور اسرائیل کی سلامتی یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ تیل اور دیگر معاملات میں امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کا ذریعہ رہا ہے۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ اسرائیل کو اب تک ریاستی سطح پر کسی بڑے خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔ اور ۱۹۷۳ء کے بعد سے اب تک اُسے ایک بھی بڑی اور کھلی جنگ نہیں لڑنی پڑی ہے۔

فلسطین کے تنازع کے ہوتے ہوئے عرب دنیا نے اسرائیل کے ساتھ مل کر مشترکہ دشمنوں کے خلاف کام کیا ہے۔ عام طور پر تیل کی فروخت کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہی ہے اور وہ بھی کمتر قیمت کے ساتھ۔ کسی بھی ملک نے، حد یہ ہے کہ چین نے بھی اب تک مشرقِ وسطیٰ میں امریکا کے تصرف اور برتری کو براہِ راست چیلنج کرنے سے گریز کیا ہے۔ چین نے اب تک ایک طرف آرام سے بیٹھ کر محض تماشا دیکھنے کو ترجیح دی ہے۔ امریکا نے مشرقِ وسطیٰ میں بالعموم اور خلیج کے خطے میں بالخصوص سلامتی کی جو فضا بنائی، اُس سے چین نے بھی بھر پور استفادہ کیا۔

امریکا نے مشرقِ وسطیٰ سے جو فوائد بٹورے ہیں، وہ اُن جنگوں کی قیمت کے مطابق ہیں جو اُسے لڑنا پڑی ہیں۔ ہاں، خطے میں رہنے والوں کے لیے اِن جنگوں کی قیمت بہت زیادہ رہی ہے۔ ساڑھے تین عشروں کے دوران اسرائیل نے خطے میں اپنے کمزور پڑوسیوں کے خلاف چھوٹی جنگیں لڑی ہیں۔ حماس نے اسرائیل کے خلاف تواتر سے جو جھڑپیں کیں، اُن کے نتیجے میں اسرائیل کو غزہ کی پوری آبادی کے خلاف جانا پڑا۔ یہ نقطہ اسرائیل اور امریکا کا ہے۔ عراق پر امریکا نے کم و بیش ۱۲ر سال اقتصادی پابندیاں نافذ کیں۔ بہت زیادہ اور تواتر سے بمباری بھی کی۔ حکومت یا قیادت کی تبدیلی کی ناکام کوشش کی۔ ۲۰۰۳ء کے حملے کے بعد امریکا نے عراق کو کنٹرول کرنے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر اقدامات کیے جن کے بھاری اخراجات بھی برداشت کرنا پڑے۔ امریکا کی قیادت میں ہونے والی لڑائیوں نے لبنان، لیبیا، سوڈان، شام اور یمن کو مکمل تباہ کر دیا۔

مشرقِ وسطیٰ کا مجموعی نظام امریکا کی طرف سے دی جانے والی سلامتی کی ضمانت پر ٹِکا رہا ہے اور یہاں کے حکمرانوں کا تخت و تاج بھی۔ عرب ریاستوں میں جمہوریت کا پنپنا امریکی مفادات کے حق میں نہ تھا۔ ایران کی طرح جمہوریت کو بھی دور دور رکھنا لازم تھا۔ ڈیڑھ عشرے قبل عرب دنیا میں بیداری کی ایک لہر اٹھی مگر یہ لہر زیادہ دور اور زیادہ دیر تک چل نہ سکی۔ ابتدا میں ایسا لگتا تھا کہ عرب دنیا میں بیداری کی لہر پر قابو پانا ممکن نہ ہوگا مگر پھر آمروں نے معاملات کو کنٹرول کرلیا۔ امریکا کے قائم کردہ اتحادی نظام میں شامل تمام ہی حکومتیں برقرار رہیں۔ اُنہوں نے احتجاج کرنے والوں کو کنٹرول کرنے کے لیے اقتدار پر اپنی گرفت مزید مضبوط کی۔ نیولبرل معاشی اصلاحات کو آگے بڑھانے میں امریکی کردار نے خطے میں زیادہ سے زیادہ نجکاری کی راہ ہموار کی۔ اِس کے نتیجے میں حکمراں طبقہ غیر معمولی حد تک کرپٹ ہوا اور خطے کے عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ خطے کے حکمرانوں کو اس بات کی تحریک ملی کہ سلامتی اور نگرانی کے نام پر زیادہ سے زیادہ، سخت تر نگرانی کریں اور ممکنہ دشمنوں یا حریفوں کو کچل کر رکھ دیں۔ خلیج کی چند ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی تجوریاں بھرنے کا موقع ملا تاہم مجموعی طور پر خطے کے عوام کو تشدد، لاچاری اور محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی، سیاسی اور ترقیاتی سطح پر کسی بھی اور خطے کے مقابلے میں مشرقِ وسطیٰ نے امریکی چھتری تلے بہت پست کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز اور افسوس ناک امر ہے کہ امریکا کی طرف سے دی جانے والی سلامتی کی ضمانت نے اُس کے اتحادیوں واشنگٹن کے پالیسی مفاد کو نظر انداز کرنے کی راہ سُجھائی۔ خطے کے حکمرانوں نے محسوس کیا کہ امریکا کی موجودگی میں وہ اپنے سیاسی اور نظریاتی منصوبوں کو کسی خوف اور نتائج کی پروا کیے بغیر تکمیل سے ہمکنار کرنے میں مصروف رہے۔ واشنگٹن اپنے اندرونی سیاسی معاملات کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ علاقائی سطح پر ابھرنے والے معاملات پر اُس کی نظر پہلی سی نہ رہی۔ چین اور روس کی طرف سے وسیع تر

مداخلت کا خدشہ تھا۔ اِس کے نتیجے میں علاقے میں کشیدگی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک طرف امریکا عشروں تک اسرائیل کو قابو میں رکھنے میں ناکام رہا اور دوسری طرف وہ عرب ریاستوں کو بھی امریکی مفادات کے منافی پالیسیاں اختیار کرنے سے نہ روک پایا۔ کم و بیش تمام ہی علاقائی ممالک نے ۲۰۱۵ء میں ایران اور بڑی طاقتوں کے درمیان طے پانے والے جوہری معاہدے کی مخالفت کی۔ اوباما انتظامیہ کا خیال تھا کہ اس معاہدے سے خطے میں امن و استحکام یقینی بنانے میں مدد ملے گی۔

۲۰۱۷ء میں سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے مل کر قطر کا اقتصادی محاصرہ کیا۔ اس سے ایران کے خلاف زیادہ سے زیادہ دباؤ یقینی بنانے کی امریکی مہم ناکامی سے دوچار ہوئی۔

عرب دنیا میں بیداری کی لہر نے (جسے عرب اسپرنگ کا نام دیا گیا) عرب حکومتوں کو مداخلت کے نئے انداز اپنانے کی راہ سُجھائی۔ اِس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ امریکا پر اُن کا اعتماد متزلزل ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے ابھرنے والے کسی بھی خطرے سے اپنے طور پر نپٹنے کے لیے اپنے طور پر بہت کچھ کرنے کی ذہنیت اپنانے کی طرف گئے۔ خطے کی بہت سی حکومتوں کو یہ خدشہ لاحق ہے کہ اُن کے تخت و تاج کو بغاوتوں کا خطرہ ہے، بالخصوص ایرانی حمایت یافتہ مسلح گروپوں اور تنظیموں کی طرف سے۔ اسلامی اور جہادی تنظیمیں بھی خطے میں آمریت کا دور ختم کرنے کے درپے ہیں۔ نئی نسل بھی تبدیلی چاہتی ہے۔ جمہوریت آئے یا نہ آئے، تبدیلی تو سبھی چاہتے ہیں، ایسی تبدیلی جس میں ملک کا بھلا سوچا جائے اور انفرادی سطح پر اپنی تجوریاں بھرنے کا رجحان ختم ہو۔

دنیا بھر میں نئی نسل تیزی سے بے قابو ہوتی جارہی ہے۔ وہ ایسی حکومتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں جو ملک کا بھلا نہ سوچتی ہوں۔ عرب دنیا کے آمروں کو بھی اندازہ ہے کہ اگر اُن کے ہاں نئی نسل بے قابو ہوگئی تو پھر ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہے گا۔ یہ بات بھی وہ بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اُن کے اور اُن کے نظامِ حکومت کے خلاف تحریک ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ باہر بھی کسی بھی وقت شروع ہوسکتی ہے۔ حسنی مبارک نے ۲۰۱۱ء میں یہ محسوس کیا کہ کسی بھی ناگہانی صورتِ حال میں امریکا پر مکمل بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی صورتِ حال کو سنبھالنا ہے تو سب سے پہلے اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنا ہوگا۔ اندرونی چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے اپنی ہی طاقت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ امریکا اور دیگر ممالک کی مداخلت نے بارہا خطرناک نتائج پیدا کیے ہیں۔ مصر میں فوجی بغاوت ہوئی اور کئی بار خانہ جنگی کی کیفیت بھی پیدا ہوئی۔

مشرقِ وسطیٰ کے امریکی ساختہ نظام نے ایران اور اسرائیل کو ایسی پالیسیاں مرتب کرنے پر اُکسایا جن کے نتیجے میں خطے کے دوسرے ملکوں کے لیے خرابیاں پیدا ہوئیں۔ ہاں، طریقِ کار دونوں کا مختلف تھا۔ ایران نے بیرونی جارحیت کو اپنے وجود اور بقا کے خلاف حقیقی خطرہ گردانتے ہوئے ایسی پالیسی مرتب کی جس کے نتیجے میں اُس کے پڑوسیوں کے لیے مشکلات پیدا ہوئیں۔ امریکا کی طرف سے تھوپی جانے والی اقتصادی پابندیوں کو بھی ایران نے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی اور اپنے طور پر اندرونی سلامتی بنائے رکھنے پر متوجہ رہا۔ ایران میں بلیک مارکیٹنگ روکنے کی کوششیں بہت حد تک کامیاب رہی ہیں۔

کئی عشروں کے دوران ایران نے غیر ریاستی عناصر کو اتحادی بنا کر ایک ایسا نیٹ ورک تیار کیا جو امریکا، اسرائیل اور سعودی عرب کی جنگوں کی باقیات سے پروان چڑھتا رہا۔ امریکی اور ایرانی ٹیکنالوجی تک رسائی نہ ہونے پر ایران نے کم لاگت میں اپنی دفاعی پروڈکشن پر توجہ دی۔ ڈرون بنائے گئے ہیں اور سستے بیلسٹک میزائل بھی تیار کیے گئے ہیں۔ یہ سستے میزائل بھی حریفوں کے جدید ترین میزائلوں اور وار مشین کے دیگر حصوں کا کامیابی سے سامنا کرتے آئے ہیں۔ خطے کے دیگر ممالک کی طرح ایران نے بھی اپنے ہاں نئی نسل کو کنٹرول کیا ہوا ہے اور کسی بھی حال میں سسٹم کے خلاف بڑے پیمانے کے احتجاج کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اسرائیل کو امریکا کی طرف سے سلامتی کے حوالے سے غیر معمولی تعاون حاصل رہا ہے۔ کہنے کو اسرائیل میں بھی جمہوریت ہے مگر صرف یہودیوں کے لیے۔ اسرائیلی وزرائے اعظم بھی اُسی راہ پر گامزن رہے ہیں جس پر امریکا کے دیگر علاقائی حکمراں اتحادی گامزن رہے ہیں۔ اسرائیلی حکومت بھی بیشتر فیصلے خالص آمرانہ انداز سے کرتی ہے۔ ایک طرف تو اسرائیل خود بھی مضبوط اور پُراعتماد ہے اور دوسری طرف امریکا بھی اُس کی پشت پر کھڑا رہا ہے۔ بہت سے بحرانوں سے گزرنے پر بھی اسرائیلی حکومت اِسی لیے اپنے آپ کو مشکلات سے نپٹنے کے قابل بنائے رکھا ہے۔ فلسطینی مزاحمت کاروں سے نپٹنا اِسی لیے اسرائیل کے لیے زیادہ مشکل نہیں رہا۔ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کے حملوں کے بعد اسرائیل نے فلسطینی مزاحمت کاروں سے کچلنے کے لیے بھرپور طاقت استعمال کی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اسرائیل خطے میں بہت بڑے پیمانے پر طاقت کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ اسرائیل نے غزہ اور غربِ اردن کے علاوہ لبنان اور شام کے بعض علاقوں پر بھی اپنا تصرف قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

امریکا اب تک مشرقِ وسطیٰ میں اپنا نظام برقرار رکھنے میں اس لیے بھی کامیاب رہا کہ اُس کی حقیقی آزمائش نہیں ہوئی تھی۔ خطے کے قائدین نے بارہا کہ وہ امریکا سے جان چُھڑالیں گے مگر ایسا وہ کر نہ پائے۔ ایک زمانے تک خطے میں کسی بڑی بین الریاستی جنگ کی گنجائش کم ہی پیدا ہوئی۔ اسرائیل نے فلسطینی علاقوں اور لبنان کو نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری رکھا مگر خطے کے کسی بھی عرب ملک نے امریکا کا اتحادی ہونے کے ناطے کچھ بولنا یا کرنا ضروری نہ سمجھا اور مجموعی ردِعمل ایسا تھا گویا کچھ ہو ہی نہ رہا ہو۔

ایران اپنے پڑوسیوں کے لیے پریشانی کا باعث تو تھا مگر ایران سے براہِ راست اسرائیل پر کسی حملے کی گنجائش کم ہی دکھائی دیتی تھی۔ ایران کی پروردہ اور حمایت یافتہ ملیشیا کے حملوں نے یہ بات مزید واضح کردی کہ ایران براہِ راست حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اور یہ بھی وہ امریکی بالادستی اور تصرف کو چیلنج کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

۲۰۱۹ء میں ایران نے سعودی عرب میں تیل کی تنصیبات پر حملے کیے تو امریکا نے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ پھر ۲۰۲۲ء میں متحدہ عرب امارات پر ایران کی حمایت یافتہ یمنی حوثی ملیشیا کے حملے ہوئے تب بھی امریکا نے کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سلامتی کا علاقائی سیٹ اپ موجود تو تھا مگر اُس میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔

اِس دوران امریکا اسرائیل اور عرب اتحادیوں کے درمیان سیاسی اور عسکری تعاون کی راہ ہموار کرکے معاملات کو اداروں کی سطح پر لانا چاہتا تھا۔ یہ کوئی نیا ہدف نہ تھا۔ ۱۹۹۱ء سے اب تک ہر امریکی حکومت خطے میں ایران مخالف اتحاد کو مضبوط بنانے پر متوجہ رہی ہے۔

۲۰۲۰ء میں امریکا نے معاہدۂ ابراہیمی کے ذریعے بھی خطے کے ممالک کو اسرائیل کے ساتھ ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔ اس میں بحرین، یو اے ای، مراکش اور دیگر ممالک شامل ہوئے۔ بائیڈن انتظامیہ نے سعودی عرب کو

بھی اس معاہدے کا حصے بننے کی تحریک دی مگر یہ بات بھول گئی کہ فلسطین کا مسئلہ سعودی باشندوں کی نظر میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اور پھر ریاض اور ابوظہبی کے درمیان پائی جانے والی مسابقت اور کشیدگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معاہدہ فلسطینیوں کا بنیادی مسئلہ بھی نظر انداز کر گیا۔

ایسا نہیں ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی پوزیشن کے لیے پہلے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا۔ عراق میں ۲۰۰۳ء میں چھیڑی جانے والی جنگ امریکا کے لیے بہت بڑا دردِ سر ثابت ہوا۔ بل کلنٹن سے اب تک ہر امریکی اِس بات کو بنیاد بنا کر ووٹ لیتا رہا کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مداخلت کم کی جائے گی۔ یہ اور بات کہ ہر امریکی صدر دلدل میں دوبارہ دھکیلے جانے پر کچھ نہ کر پایا۔

اب یہ بات صاف محسوس ہوتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی نظام مزید نہیں چلایا جا سکتا۔ امریکا چونکہ ہر معاملے میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے، اِس لیے اُس کا اثر و رسوخ راتوں رات ختم کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات خطے کی ریاستیں بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ ایران جنگ کے معاملے میں امریکا سے متعلق یہ تاثر بھی مٹی میں مل گیا کہ وہ عسکری معاملات میں کسی کو بھی کسی بھی وقت پچھاڑ سکتا ہے اور اُسے کوئی نہیں پچھاڑ سکتا۔ عرب ریاستیں بھی جانتی ہیں کہ امریکا نے سلامتی کی جو ضمانت فراہم کی تھی، اُس کا کچھ خاص فائدہ نہیں پہنچا۔

ایسے میں امریکا بھی اخلاقی طور پر کچھ زیادہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ سابق امریکی صدر جو بائیڈن بھی غزہ کے حوالے سے اسرائیل کو روکنے میں ناکام رہے تھے اور اِس کے نتیجے میں علاقائی سطح پر امریکا کی اسٹینڈنگ کمزور ہوئی تھی۔ بائیڈن نے بھی اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات معمول کی سطح پر لانے اور دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی تھی مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

اسرائیل جب غزہ، عراق، لبنان، شام، یمن اور قطر پر حملے کر رہا تھا تب بھی متحدہ عرب امارات نے اُس سے تعلقات منقطع نہیں کیے۔ امریکی اخبار ’وال اسٹریٹ جرنل‘ نے بتایا ہے کہ ایران پر اسرائیلی حملے ممکن بنانے میں متحدہ عرب امارات نے بھی اپنا کردار ادا کیا تھا۔ سعودی قیادت اسرائیل اور یو اے ای کے درمیان اشتراکِ عمل کو بے چینی سے دیکھتا رہا ہے۔ سعودی عرب اب شام میں قائم ہونے والی حکومت کی حمایت ہی نہیں، مدد بھی کر رہا ہے۔ یو اے ای شام میں بہت حد تک اسرائیل کے ساتھ ہے اور یمن کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی کیونکہ سعودی عرب نے وہاں سے یو اے ای کی حمایت یافتہ ملیشیا کو نکال باہر کیا ہے۔ سعودی عرب نے اس بات کی شکایت بھی کی ہے کہ یو اے ای شام اور یمن میں علیحدگی پسند تحریکوں کی معاونت کی ہے۔ سعودی قیادت یو اے ای اور اسرائیل کے درمیان اسٹریٹجک پارٹنرشپ کو سعودی عرب کے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔ سعودی قیادت پورے خطے کی قائد بننا چاہتی ہے اور اس معاملے میں ایران بھی اُس کی راہ میں دیوار بنتا رہا ہے۔ سعودی عرب کا یہ بھی شکوہ ہے کہ اسرائیل اور یو اے ای کی پارٹنرشپ نے امریکا کو ایران کے خلاف خطے کے تمام ممالک کو ایک لڑی میں پرونے سے بھی روک رکھا ہے۔

عرب ممالک اس بات پر بھی ناراض ہیں کہ امریکا نے اسرائیل کے ساتھ مل کر ایران کے خلاف جنگ چھیڑنے سے قبل اُن سے مشاورت نہیں کی اور اعتماد میں بھی نہیں لیا جبکہ اُسے یہ معلوم تھا کہ خلیجی ممالک ایران کے خلاف جنگ چھیڑنے کے مخالف تھے اور عمان کی وساطت سے ایران سے مذاکرات بھی چل رہے تھے۔ جس جنگ میں خلیجی ممالک کی مرضی شامل نہیں تھی، اُس نے اُن تمام ملکوں کو ایرانی جوابی حملوں کا نشانہ بنا دیا۔ امریکا کے فضائی دفاعی نظام نے ایرانی حملوں کو بہت حد تک روکا مگر پھر بھی خلیجی ریاستوں پر ایرانی حملوں نے اُن کی سلامتی اور استحکام کے ساتھ ساتھ سرمایہ کاری کے لیے اُن کے موزوں ہونے کا تصور بھی مٹی میں ملا دیا۔ ایران جنگ نے امریکی تصرف کے خاتمے کی راہ تو ہموار کی ہی تھی، خلیجی ریاستوں کا معاشی مقام بھی مشتبہ بنا دیا۔ خلیج کے ملکوں میں اہم ترین تنصیبات پر ایرانی حملوں نے امریکی بالادستی اور ہمہ گیریت کو چکنا چور کر دیا۔

زمانہ بدل چکا ہے

امریکا کے لیے سوئیز مومنٹ آ چکی ہے۔ اب وہ مشرقِ وسطیٰ کو اپنے نظام کے زیرِ سایہ نہیں رکھ سکتا۔ اُس کے اتحادی اور پارٹنر بھی اُس پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں۔ موجودہ خلیجی صورتِ حال اور نہرِ سوئیز کے بحران کے وقت میں اچھی خاصی مماثلت تلاش کی جا سکتی ہے مگر یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اِس کے لیے سوچ بھی نئی چاہیے۔ دنیا دو قطبی تھی۔ پھر یک قطبی ہوئی جس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں اور اب دنیا کثیر قطبی ہو چکی ہے یعنی ایک اور دو نہیں بلکہ کئی طاقتیں مل کر عالمی نظام چلائیں گی۔ امریکا کے سامنے اب چین کھڑا ہے اور بھارت بھی اگرچہ ترقی یافتہ نہیں مگر اپنی بات بہت حد تک منوانے کی پوزیشن میں ہے کیونکہ وہ بہت بڑی منڈی بھی ہے اور افرادی قوت کی فراہمی کا ایک ذریعہ بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ خلیجی ریاستیں ایک ہی ہلّے میں امریکا سے جان چُھڑا لیں گی مگر اب یہ عمل شروع ہو چکا ہے اور دھیرے دھیرے امریکا کے لیے معاملات زیادہ سے زیادہ ناموافق ہوتے جائیں گے۔ یہ طے ہے کہ اب امریکا خلیج کے لیے کوئی بڑا دفاعی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فی الحال کوئی مضبوط اور واضح متبادل نہ پا کر خلیجی ریاستیں کچھ مدت کے لیے امریکا سے زیادہ قریب بھی ہوں مگر اِس کے نتیجے میں امریکا کا کھویا ہوا مقام بحال نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خطے کو ایران سے محفوظ رکھنے میں ناکام رہا ہے۔ خلیجی ریاستیں اسرائیل اور ایران کے لیے خطرہ بننے کی پوزیشن میں نہیں۔ امریکا اور اسرائیل کے تعلقات مضبوط ہیں اور فی الحال اُن میں کوئی بڑی دراڑ پڑتی دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے میں عرب ریاستیں اسرائیل سے بہتر تعلقات اُستوار کر کے اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تقویت بہم پہنچانے کی کوشش کرتی رہیں گی۔ اُنہیں اسرائیل سے عسکری اور نگراں ٹیکنالوجیز بھی درکار ہوں گی۔ (مترجم: ابوصباحت)

"The end of the American Middle East".
("Foreign Affairs". August 18, 2026)

* * *

بقیہ: تہذیبوں کا تصادم اور جان ایسپوزیٹو کی تنبیہ

یہ وقت ہے کہ ہم اس تنبیہ کو یاد کریں جو ایسپوزیٹو نے ۲۵ سال سے بھی زیادہ عرصہ قبل اپنی کتاب The Islamic Threat میں کی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا:

”ہمارا چیلنج یہ ہے کہ ہم مسلم دنیا کی تاریخ اور اس کی حقیقی صورتِ حال کو بہتر طور پر سمجھیں۔۔۔ تاکہ ہم ایسے خدشات کو خود حقیقت میں بدل دینے سے بچ سکیں جو مغرب اور ایک ’انتہا پسند اسلام‘ کے درمیان جنگ یا تہذیبوں کے تصادم کی راہ ہموار کرتے ہیں۔“

ایسپوزیٹو کی یاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ ان کا علمی ورثہ آج پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ (مترجم: محمود الحق صدیقی)

"John Esposito's warning against a clash of civilisations has never been more urgent".
("middleeasteye.net". July, 24 2026)

* * *

ترکیہ: ایردوان کی آق پارٹی کے ۲۵ برس

افتخار گیلانی

ترکیہ کے دارالحکومت انقرہ کے نیشنز گارڈن (ملت باہچیسی) میں جب شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، تو ترکیہ کے صدر رجب طیب ایردوان اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ پچیس برسوں کے طویل اور کٹھن سیاسی سفر کی تھکن ان کے قدموں سے جھلک رہی تھی اور وہ شاید اب اس تیز رفتاری اور جوش کے ساتھ نہیں چل پا رہے تھے، لیکن مائیک سنبھالتے ہی ان کی آواز میں وہی پرانی گرج اور جادوئی للکار تھی جس نے سامنے موجود لاکھوں انسانوں کے سمندر کو مسحور کر کے رکھ دیا۔

انہوں نے اپنے اسی پر جوش اور سحر انگیز انداز میں عوام کو ۲۰۰۳ء سے پہلے کے اس تاریک، شکستہ حال اور بے بس ترکیہ کی یاد دلائی جو سیاسی انتشار، معاشی دیوالیہ پن اور فوجی تسلط کے بوجھ تلے سسک رہا تھا۔

انہوں نے ہجوم کو یاد دلایا کہ کس طرح ان کی پارٹی کی آمد نے اس قوم کے مقدر کو بدل کر رکھ دیا اور ترکیہ کو بحرانوں کے دلدل سے نکال کر عالمی وقار کی بلندیوں تک پہنچایا۔

یہ جلسہ برسر اقتدار انصاف و ترقی پارٹی جسے عرف عام میں آق پارٹی کہتے ہیں، کے ۲۵ سال مکمل ہونے کی خوشی میں منعقد کیا گیا تھا۔ کثیر جماعتی اور مسابقت والے جمہوری نظام میں کسی سیاسی جماعت کا مسلسل اتنے طویل عرصے تک حکمران رہنا غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۴/اگست، ۲۰۰۱ء کو وجود میں آئی اس نومولود سیاسی جماعت کو ملکی سیاست کے افق پر ابھرنے اور عام انتخابات میں فتح حاصل کرنے کے لیے محض پندرہ ماہ کا مختصر ترین وقت درکار رہوا۔

یہ جماعت نومبر ۲۰۰۲ء میں حکومت میں آئی اور پھر ابھی تک ایوانِ اقتدار سے باہر نہیں ہوئی ہے۔ اپنے پچیس سالہ سفر کے دوران تقریباً چوبیس برسوں تک اس نے سیاست میں مرکزی حیثیت برقرار رکھی ہے۔

اس سفر کے دوران عدالتوں اور فوجی مداخلتوں کے ذریعے اس کے وجود کو ختم کرنے کی قانونی، آئینی اور انتظامی کوششیں کی گئی۔ جولائی ۲۰۱۶ء میں تو ایک خونریز فوجی بغاوت نے بھی اس کی بقا کا امتحان لیا۔

اس جماعت کے اقتدار میں آنے کے ایک سال بعد یعنی ۲۰۰۳ء میں اس کے بانی رجب طیب ایردوان، ملک کے وزیر اعظم منتخب ہوئے، پھر ۲۰۱۴ء میں صدر کے منصب پر فائز ہوئے، اور بالآخر ایک بنیادی طور پر تبدیل شدہ صدارتی و انتظامی نظام کے تحت ملک کے پہلے با اختیار صدر بن گئے۔

یہ سوال غور طلب ہے کہ ۲۰۰۱ء میں جنم لینے والی ایک نئی سیاسی جماعت کس طرح اکیسویں صدی کے پہلے پچیس برسوں میں جدید ترکیہ کی شناخت اور اس کے وجود کا بنیادی استعارہ بن گئی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایردوان ترکیہ کی روایتی اسلامی سیاسی تحریک کی گود سے ہی ابھر کر سامنے آئے۔ لیکن صرف مذہبی و قدامت پسند ووٹر تنہا ان کے حق میں اتنے ووٹ اکٹھے نہیں کر سکتے تھے جن کے بل بوتے پر وہ پے در پے اتنے بڑے پیمانے پر قومی فتوحات حاصل کرتے رہے۔

ان کا سب سے بڑا سیاسی اور تزویراتی کمال یہ ہے کہ انہوں نے آق پارٹی کی صورت میں ایک ہمہ جہت اور وسیع تر عوامی اتحاد کو جوڑا، جس کا بنیادی حمایتی ووٹر اسلام پسند ہے، مگر اس نے اپنے ساتھ ترک قوم پرست، بائیں بازو، لبرل جمہوریت پسند ووٹروں کو ساتھ ملا کر فوج کی پشت پناہی سے قائم سخت گیر سیکولر نظام کو چیلنج کیا۔ چھوٹے قصبوں کے ابھرتے ہوئے تاجروں اور اناطولیہ کے نئے متوسط طبقے کو اس قیادت میں معاشی استحکام، ترقی اور بین الاقوامی منڈیوں تک رسائی کی نئی امید دکھائی دی۔

نیو یارک ٹائمز کے استنبول بیورو کے سابق سربراہ اور معروف کتاب کریسنٹ اینڈ اسٹار: ترکی بیٹوین ٹو ورلڈز کے مصنف اسٹیفن کنزر کے مطابق ایردوان نے دو ایسے بااثر گروہوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کامیابی حاصل کی جو تاریخی طور پر ہمیشہ ایک دوسرے کو شدید نفرت اور شکوک و شبہات کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ان کا کہنا ہے کہ آق پارٹی نے مذہبی شعور رکھنے والے قدامت پسند طبقے اور جدید جمہوریت کے علمبرداروں کو یکجا کر دیا۔ پچیس سال گزرنے کے بعد بھی ایردوان کی سیاست کی تفہیم کے لیے یہ تجزیہ ایک بہترین بنیاد فراہم کرتا ہے۔

آق پارٹی ترکیہ کی تاریخ کے ایک انتہائی تلخ، تاریک اور تباہ کن دہائی کے فوراً بعد اقتدار میں آئی تھی۔ ملک اس سے قبل شدید عدم استحکام کی شکار مخلوط حکومتوں، پر اسرار سیاسی ہلاکتوں، کرد علیحدگی پسندی اور شورش، سنگین مالیاتی عدم استحکام، اور طاقتور فوجی اسٹیبلشمنٹ کی بار بار کی سیاسی مداخلتوں کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔

فوج خود کو جمہوریہ اور آئین کا واحد اور حتمی نگہبان سمجھتی تھی۔ بار بار کی فوجی بغاوتوں کے علاوہ ۱۹۹۷ء میں فوجی دباؤ اور دھمکیوں کے ذریعے وزیر اعظم نجم الدین اربکان کی منتخب حکومت کو اقتدار سے باہر کر دیا گیا تھا۔

ایردوان ان کی رفاہ پارٹی کے ایک رکن تھے۔ اس اقدام، جسے جدید فوجی انقلاب کا نام دیا گیا، کے بعد ایسے سخت گیر ریاستی قوانین نافذ کیے گئے جن کا مقصد ملک میں مذہبی تعلیم کو محدود کرنا اور عوامی زندگی و ریاستی اداروں میں اسلامی شناخت اور اس کے اثرات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔

سر پر اسکارف یا حجاب لینے والی طالبات اور خواتین کے لیے یونیورسٹیوں، عدلیہ، پارلیامان اور تمام سرکاری محکموں کے دروازے سختی سے بند کر دیے گئے۔

تاریخی امام حاطب مذہبی اسکولوں کے نصاب پر شکنجہ کس دیا گیا اور ان کے فارغین پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند کر دیے گئے۔ سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد کی گئیں اور کئی کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ گو کہ اس طرح کے قوانین اس سے قبل بھی ترکیہ میں ۱۹۲۳ء سے رائج تھے، مگر ان میں بتدریج نرمی لائی گئی تھی، جواب دوبارہ سخت کر دی گئیں۔

انہی حالات میں ایردوان کا عروج ہو رہا تھا۔ ایک محنت کش متوسط خاندان سے تعلق رکھنے والے استنبول کے پسماندہ محلے قاسم پاشا میں پروان چڑھنے والے ایردوان نے اربکان کی سیاسی تحریک میں نچلی سطح کے کارکن کے طور پر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور بالآخر ۱۹۹۴ء میں استنبول کے میئر منتخب ہو کر سب کو حیران کر دیا۔

کنزر نے نوجوان ایردوان کو ایک ایسی شخصیت قرار دیا جو استنبول کے روایتی اشرافیہ، مغربی ذہنیت کے حامل ایلیٹ کلاس اور سیکولر بیوروکریسی سے کوسوں دور تھا۔ وہ ایک سابق فٹ بالر اور محنت کش سیلز مین تھے جن کی گہری مذہبی وابستگی اور پابندیِ شریعت نے انہیں قدرتی طور پر اسلام پسند عوامی سیاست کی طرف مائل کیا تھا۔

مگر بطور میئر انہوں نے جس طرح استنبول جیسے بڑے شہر کا انتظام چلایا، وہ ہی ان کی عوامی مقبولیت کا باعث بنا۔ کوڑے کرکٹ اور تعفن کا شکار آبنائے باسفورس اور شاخ

زریں جیسی پانی کی گذرگاہوں کی مکمل صفائی، استنبول کے دہائیوں پرانے پانی کے شدید بحران کا مستقل خاتمہ، نکاسیِ آب کے ناقص نظام کی درستی، کچرے کوٹھکانے لگانے کے جدید انتظامات اور پبلک ٹرانسپورٹ کے نظام کو سنوارنا ان کے دورِ حکومت کی نمایاں پہچان بن گئے۔

اردوان نے سیاست اور عوامی نفسیات کے بنیادی سبق کو دیگر روایتی سیاست دانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ گہرائی سے سمجھ لیا تھا۔ ان کے مطابق ایک سیاست دان اپنی آتشیں اور جوشیلی تقریروں اور نظریات کا استعمال کر کے عوام سے داد اور وقتی تالیاں تو سمیٹ سکتا ہے، لیکن شہریوں کی پائیدار وفاداری غریب اور امیر دونوں کے گھر کے نلکوں میں صاف پانی کے بہنے سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

لیکن ان کا ابھرتا ہوا سیاسی کیریئر اس وقت بظاہر ہمیشہ کے لیے ختم ہوتا دکھائی دیا جب ایک جلسہ عام میں محض ایک اسلامی وقومی نظم کے اشعار پڑھنے کے جرم میں ان پر عدالت کی جانب سے فردِ جرم عائد کردی گئی، ان کے کسی بھی عوامی عہدے پر فائز ہونے پر تاحیات پابندی لگادی گئی اور انہیں کئی ماہ کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔

مگر اس قید و بند نے اردوان کو زیادہ پختہ کار، نڈر اور تزویراتی صلاحیتوں سے لیس سیاست دان بنا کر ابھارا۔

سترہ اگست ۱۹۹۹ء کو شمال مغربی ترکیہ میں ایک انتہائی خوفناک زلزلہ آیا جس نے پورے خطے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس زلزلے کا مرکز صنعتی پٹی کے قلب میں واقع شہر ازمیت کے قریب تھا، جو استنبول کے گنجان آباد شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس المناک آفت میں تقریباً اٹھارہ ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے۔

اس قدرتی آفت نے ملک میں جاری ناقص، غیر معیاری تعمیرات، ضوابط کے مکمل فقدان اور ریاستی بدعنوانی کو بے نقاب کر دیا۔ حکومتی اداروں کا امدادی ردعمل انتہائی سست، لاچار اور نااہل ثابت ہوا۔

ترک صحافی محمد اوزترک اس دور کو یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس آفت اور حکومت کی بے حسی نے روایتی سیاسی جماعتوں کے خلاف عوام کے دلوں میں شدید غصہ، نفرت اور بیزاری بھر دی، جس نے درحقیقت اس انتخابی انقلاب کی راہ ہموار کی جو ٹھیک تین سال بعد اردوان کی نئی جماعت کو اقتدار کے ایوانوں میں لے آئی۔

اس المیے کے فوراً بعد، ۲۰۰۱ء میں ترکیہ پر بدترین مالیاتی و اقتصادی تباہی ٹوٹ پڑی۔ ملک کے بڑے بڑے بینک دیوالیہ ہو گئے۔ لاکھوں کاروبار بند ہو گئے۔ افراطِ زر آسمان سے باتیں کرنے لگا اور ترک لیرا کی قیمت کوڑیوں کے مول آ گئی۔ ترکیہ نے ۱۹۶۱ء سے لے کر اس وقت تک عالمی مالیاتی فنڈ کے ساتھ انیس مختلف بیل آؤٹ معاہدے کیے تھے۔

صدی کے آغاز پر آنے والے اس خوفناک بحران کے نتیجے میں ترکیہ پر عالمی مالیاتی فنڈ کا قرضہ بڑھ کر تقریباً ساڑھے تیئیس ارب ڈالر تک جا پہنچا تھا۔ کرنسی کی زبوں حالی کا عالم یہ تھا کہ سال ۲۰۰۰ء میں ایک امریکی ڈالر کے بدلے چھ لاکھ بیس ہزار سے ساڑھے چھ لاکھ تک ترک لیرا ملتے تھے۔

ان تباہ کن حالات کے پس منظر میں، ۱۴/اگست ۲۰۰۱ء کو اردوان اور ان کے سیاسی ساتھیوں نے اربکان سے علیحدگی اختیار کر کے ایک نئی آق پارٹی کی بنیاد رکھی۔ پارٹی کے باضابطہ آغاز اور منشور کے اعلان کے وقت اردوان نے ایک تاریخی جملہ کہا، جو آج کسی روایتی انتخابی نعرے کے بجائے ایک سچی پیش گوئی معلوم ہوتا ہے، ’اب ترکیہ میں کبھی بھی کچھ پہلے جیسا نہیں رہے گا۔‘ ترک عوام نے ان پر بھروسہ کر کے محض پندرہ ماہ بعد ووٹوں کے ذریعے ان کو اقتدار تک پہنچا دیا۔

تین نومبر ۲۰۰۲ء کے تاریخی عام انتخابات میں، آق پارٹی نے ۳۴٫۲۸ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ چونکہ ملک کی روایتی اور قائم شدہ سیکولر وقوم پرست جماعتیں دس فیصد کی لازمی انتخابی حد عبور کرنے میں بری طرح ناکام ہوگئی تھیں، اس لیے اس نئے سیاسی قافلے کو تن تنہا پارلیمان میں دو تہائی کے قریب تاریخی اکثریت حاصل ہوگئی۔

تاہم، رجب طیب اردوان خود پارلیمنٹ کے رکن نہیں بن سکتے تھے کیونکہ ان پر عدالتی سزا اور سیاسی پابندی کا قانون اب بھی پوری قوت سے نافذ تھا۔ چنانچہ ان کے قریبی ساتھی عبداللہ گل نے وزیراعظم بن کر عبوری حکومت تشکیل دی۔

جب نئی منتخب پارلیمنٹ نے آئین اور متعلقہ انتخابی قوانین میں ضروری ترامیم منظور کیں، تو مارچ ۲۰۰۳ء میں سرت کے علاقے میں دوبارہ ہونے والے ضمنی انتخاب میں اردوان نے حصہ لیا، بھاری اکثریت سے پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور بالآخر ملک کے وزیراعظم کا منصب سنبھال لیا۔

وہ رہنما جو کل تک قیدی بنا کر جیل میں ڈالا گیا تھا، اب اسی حکومت کا سب سے بڑا سربراہ اور بااختیار حکمران بن چکا تھا جس نے کبھی اسے قید کیا تھا۔

اسٹیفن کنزر کا کہنا ہے کہ کہ مارچ ۲۰۰۳ء میں وزارتِ عظمیٰ سنبھالنے کے بعد اردوان نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ ان کی فوری اور اولین ترجیح مذہبی عبادات یا رسومات پر سے پابندیاں ہٹانا نہیں، بلکہ ترکیہ کو یورپی یونین کا مکمل رکن بنوانا ہے۔

یورپی یونین کی شرائط میں ملک میں مکمل جمہوریت کا اطلاق، سویلین بالادستی کا قیام، انسانی حقوق کے بنیادی ڈھانچے میں وسیع اصلاحات اور فوج کے ان تمام اداروں کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا شامل تھا جن کے ذریعے فوجی اسٹیبلشمنٹ سیاست دانوں پر اپنی سرپرستی اور حکمرانی قائم رکھتی تھی۔

اس صورتحال میں سیکولر اور لبرل دانشوروں نے بھی، جنہیں سیاسی اسلام یا دینی تحریکوں سے رتی برابر بھی ہمدردی نہیں تھی، ان اصلاحات کی غیر مشروط حمایت کی۔ نیشنل سکیورٹی کونسل کا ڈھانچہ مکمل طور پر تبدیل کر دیا گیا اور اس میں سویلین ارکین کے اثر و رسوخ کو وسیع کر دیا گیا۔ فوج کے خفیہ اور ترقیاتی بجٹ کو پارلیمانی جانچ پڑتال اور آڈٹ کے تابع کر دیا گیا۔

بدنامِ زمانہ ریاستی سکیورٹی عدالتوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا، اور وسیع قانونی ترامیم کے ذریعے ملک میں کردوں اور دیگر اقلیتوں کے ثقافتی ولسانی حقوق کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا۔ آئینی عدالت میں فوجی ممبرشپ ختم کر دی گئی۔ ۲۰۰۴ء تک یورپی اداروں نے اعتراف کرنا شروع کر دیا کہ یورپی یونین کی امیدواری کے عمل کے تحت ترکیہ میں سویلین اتھارٹی اور جمہوری اداروں کے اختیارات میں تاریخی، غیر معمولی اور گہرا اضافہ ہو رہا ہے۔

اسی دوران اس نوخیز اور ابھرتی ہوئی حکومت کو اپنی خارجہ پالیسی کے پہلے اور انتہائی اعصاب شکن امتحان کا سامنا کرنا پڑا۔ ۲۰۰۳ء میں امریکا، عراق پر مکمل فوجی یلغار اور جارحیت کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا۔

پینٹاگون کے فوجی منصوبہ ساز صدر صدام حسین کی حکومت پر جنوبی اور شمالی دونوں سمتوں سے بیک وقت کاری ضرب لگانا چاہتے تھے۔ اس شمالی محاذ کے قیام اور اپنی فوجوں کے گزرنے کے لیے انہیں ترکیہ کی سرزمین اور اڈوں کی اشد ضرورت تھی۔

امریکی منصوبہ سازوں نے پرانی روایت کے پیشِ نظر یہ

فرض کرلیا تھا کہ انقرہ بلا چوں و چرا ان کے تمام مطالبات تسلیم کر لے گا۔ اس منصوبے کو قابلِ قبول بنانے کے لیے امریکا نے ترکیہ کی کمزور معیشت کے لیے بیس ارب ڈالر سے زائد کے قرضوں، گرانٹس اور مالی مراعات کی پیشکش بھی رکھی۔ لیکن یکم مارچ ۲۰۰۳ء کو ترکیہ کی پارلیمنٹ نے تاریخی ووٹنگ کے ذریعے امریکا کو یہ فوجی سہولیات فراہم کرنے کی قرارداد کو مسترد کر دیا۔

کنزر نے اس فیصلے کو جدید ترکیہ کی تاریخ کا وہ پہلا فیصلہ قرار دیا جہاں اس نے اپنے ایک انتہائی اہم سکیورٹی معاملے پر امریکا کے سامنے کھل کر 'نہ' کہنے کی جرأت کی تھی۔

ایک ایسی حکومت کے لیے جس کو اقتدار سنبھالے محض چند ماہ ہوئے تھے، یہ ایک بے باک، جرأت مندانہ اور تاریخی لمحہ تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر، اس فیصلے نے اس تزویراتی سوچ اور نظریے کی بنیاد رکھ دی جو ایردوان کے پورے دورِ حکومت میں بتدریج مستحکم ہوتی چلی گئی: یعنی ترکیہ مغربی اتحاد کا حصہ اور رکن تو رہ سکتا ہے، لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ وہ مغرب کے ہر حکم اور مطالبے کے سامنے بغیر سوچے سمجھے سر جھکا دے۔ اس فکری اور سفارتی نظریے کو بعد میں 'تزویراتی خودمختاری' کا نام دیا گیا۔

بین الاقوامی میدان میں ایک خودمختار، باوقار اور بااثر عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے سے قبل ایردوان کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنے اندرونِ ملک عوام کو حقیقی معاشی خوشحالی اور خدمات کی فراہمی کر کے دکھائیں۔ یہاں وزیرِاعظم ایردوان نے اپنے استنبول کی بلدیاتی سیاست کے شاندار اور کامیاب تجربات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ یورپی یونین کا رکن بننے کی ترکیہ کی تگ و دو کے باعث دنیا بھر سے سرمایہ کاروں نے یہاں سرمایہ کاری شروع کر دی، اور ملک میں سرمائے کی زبردست ریل پیل ہوگئی۔

اس سرمایہ کا استعمال کرتے ہوئے اناطولیہ کے وسیع و عریض خطوں میں جدید دورویہ موٹرویز اور کشادہ شاہراہوں کا جال بچھا دیا گیا، چھوٹے اضلاع اور صوبائی مراکز کو مرکزی ایکسپریس ویز سے جوڑ دیا گیا، اور ملک میں تاریخ کی پہلی جدید ہائی اسپیڈ ریلوے کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔

استنبول کو مارمرے میٹرو کا تحفہ ملا، جو آبنائے باسفورس کے گہرے سمندر کی تہہ کے نیچے سے گزرنے والی زیرِ آب ریلوے سرنگ سے گزر کر ایشیا اور یورپ کو ملاتی ہے۔ اس کے بعد 'یوریشیا' سڑک سرنگ تعمیر کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی، عالمی معیار کا وسیع و عریض استنبول ایئر پورٹ قائم کیا گیا جس نے ترکیہ کو دنیا کے عظیم ترین بین الاقوامی ایوی ایشن سنٹر میں تبدیل کر دیا۔

سالانہ فضائی مسافروں کی تعداد ہی تئیس کروڑ سالانہ سے تجاوز کر گئی ہے۔ ملک بھر میں دورویہ اور محفوظ شاہراہوں کا نیٹ ورک تقریباً پانچ گنا اضافے کے ساتھ انتیس ہزار کلومیٹر سے زیادہ تک پھیل گیا۔

دو دہائیوں میں بائیس سو کلومیٹر سے زیادہ طویل جدید ترین تیز رفتار ریلوے ٹریکس تعمیر کیے گئے ہیں۔ عوام اور ووٹروں کے لیے یہ محض اعداد و شمار یا کتابی معاشی اشاریے نہیں تھے۔

اناطولیہ کے ایک دور دراز قصبے کا تاجر اب چند گھنٹوں میں آرام دہ ٹرین یا شاہراہ کے ذریعے دارالحکومت انقرہ پہنچ سکتا تھا۔

ایک عام غریب خاندان کو سفر کے لیے سڑکوں پر پورا دن دھکے کھانے کے بجائے چند گھنٹوں میں سستی پرواز مل سکتی تھی۔ ایمبولینس کسی دور افتادہ دیہات سے مریض کو لے کر جدید ضلعی اسپتال تک چند ہی منٹوں میں پہنچ سکتی تھی۔

اگرچہ صحت کے شعبے میں ہونے والا انقلاب سڑکوں اور پلوں کی طرح بیرونی طور پر شاید اتنا پرشکوہ دکھائی نہ دیتا ہو، مگر سیاسی اور عوامی سطح پر یہ مواصلاتی ڈھانچے سے بھی کہیں زیادہ مؤثر اور اثر انگیز ثابت ہوا۔ ۲۰۰۳ء سے حکومت نے ترکیہ میں 'ہیلتھ ٹرانسفارمیشن پروگرام' کا تاریخی آغاز کیا۔ اس کے مطابق ہر ۵۰ ہزار کی آبادی پر ایک سپر اسپیشلٹی اسپتال اور صحت سے متعلق صنعتیں قائم کرنا تھا۔ اسی لیے جب ۲۰۲۰ء میں کورونا وائرس نے دستک دی، تو ترکیہ کے پاس ۵۵ ہزار آئی سی یو بیڈ تھے۔

پورے یورپ میں اتنے بیڈ مہیا نہیں تھے، جس کی وجہ سے روز یورپ کے شہروں سے ایرایمبولنس ترکیہ آتی تھیں۔

عالمی بینک نے تسلیم کیا کہ ترکیہ کی جانب سے تمام شہریوں کے لیے یکساں، مفت اور جامع ہیلتھ کیئر کی فراہمی کا یہ تیز رفتار اور انقلابی ماڈل دنیا کے کسی بھی ملک میں اپنی وسعت اور رفتار کے لحاظ سے کم ہی مثال رکھتا ہے۔

خاندانی معالج کے نظام کو گلی محلے تک وسعت دی گئی، اور جدید ترین سٹی اسپتالوں کے ذریعے اعلیٰ درجے کے علاج تک غریب ترین شہریوں کی رسائی کو ممکن بنا دیا گیا۔ سرکاری اسپتال ایسے بنائے گئے کہ جنوبی ایشیاء کے پرائیوٹ پانچ ستارہ اسپتال ان کے سامنے شرما جائیں۔

تمام کمپنیوں و دفاتر کیلئے لازم کیا گیا کہ وہ اپنے ملازمین کو دن میں ایک بار کھانا مفت کھلائیں۔ معمر شہریوں کیلئے مفت شہری ٹرانسپورٹ اور روٹی مفت مہیا کرائی گئی۔ عید کے تین روز اور قومی تہواروں کے موقع پر مفت ٹرانسپورٹ کی سہولیت رکھی گئی۔ ان اصلاحات کی سیاسی اہمیت بے پناہ تھی۔

ایک مراعات یافتہ، امیر یا اعلیٰ متوسط طبقے کے لیے سیاست کا محور شاید آئینی باریکیاں، لبرل ازم اور قانونی مباحث ہو سکتے ہیں، لیکن ایک محنت کش اور غریب خاندان کے لیے سیاست کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ آیا اس کا بیمار بچہ بغیر قرض لیے اور بغیر گھر بار بیچے کسی اچھے اسپتال میں عزت کے ساتھ ڈاکٹر سے دوائی لے سکتا ہے یا نہیں۔

صحت کی سہولیات، تیز رفتار نقل و حمل اور بنیادی عوامی خدمات میں یہ وسیع بہتری ایردوان اور ترکیہ کے کروڑوں محنت کش ووٹروں کے درمیان ایک اٹوٹ اور جذباتی رشتے کی بنیاد بن گئی۔

سال ۲۰۲۳ء میں صدارتی و پارلیمانی انتخابات کی کوریج کرتے ہوئے مشرقی ترکیہ کے زلزلہ زدہ شہروں کا دورہ کرتے ہوئے جب میں عام ترک ووٹر سے بات کرتا تھا، تو وہ ایردوان کی پالیسیوں پر شدید تنقید اور شکوے کرتا تھا، مگر صحت وسوشل سیکورٹی کی سہولیت کے حوالے سے احسان مند بھی تھا۔ اس لیے شکوہ شکایات کے باوجود ایردوان کے ہی کے حق میں مہر لگانے کے حق میں تھا۔

میں نے دیکھا کہ عام ترک وزیر کی کارکردگی سے نالاں ہے، روزمرہ کی اشیاء کی قیمتوں پر غصے کا اظہار کرتا ہے یا مقامی بلدیاتی انتخابات میں آق پارٹی کو ہراتا بھی ہے، مگر ۲۰۰۲ء سے پہلے کے وہ تاریک دن اور بوسیدہ اسپتالوں کی ذلت آمیز قطاریں یاد کر کے اس کا دل ایردوان کیلیے نرم ہو جاتا ہے۔

معاشی میدان میں آنے والی تبدیلیوں کا پیمانہ بھی اتنا ہی زبردست اور حیران کن تھا۔ ۲۰۰۴ء سے ۲۰۲۴ء کے ۲۰ سالہ عرصے کے دوران، ترکیہ کی برائے نام مجموعی ملکی پیداوار یعنی جی ڈی پی تقریباً چار سو ارب ڈالر سے چھلانگ لگا کر ایک اعشاریہ تین ٹریلین یعنی تیرہ سو ارب ڈالر کے ہندسے تک جا پہنچی ہے۔ جس ایک امریکی ڈالر کے بدلے ۲۰۰۳ء میں چھ لاکھ بیس ہزار سے ساڑھے چھ لاکھ تک ترک لیرا دینے پڑتے تھے، ۲۰۱۹ء میں وہ ڈالر محض چار لیرا پر آ گیا

تھا، اور بعد کے افراطِ زر کے دباؤ کے باوجود آج وہ چھیالیس لیرا پر مستحکم ہے۔

ترکیہ نے ۲۰۱۳ء میں عالمی مالیاتی فنڈ کے تمام تر بقایا غیر ملکی قرضے ایک ایک پائی کر کے مکمل طور پر ادا کر کے خود کو اس کے چنگل سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر لیا، اور ملک نہ صرف جی ٹوئنٹی کا ایک بااثر اور فعال رکن بنا بلکہ عالمی مالیاتی و اقتصادی نظام میں ایک مضبوط آواز بن کر ابھرا ہے۔

ترکیہ کا روایتی، پرانا اور مقتدر معاشی اشرافیہ زیادہ تر استنبول، انطالیہ اور ازمیر میں مرکوز تھا اور وہ سیکولر فوجی اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی کے ساتھ گہرے مفادات میں بندھا ہوا تھا۔

لیکن قیصری، قونیہ، غازی انتیپ، دینزلی اور دیگر روایتی شہروں نے ایک انتہائی پرعزم، محنتی اور باصلاحیت کاروباری اور صنعتی کلاس کو جنم دیا۔ یہ کاروباری لوگ اپنی ثقافت اور طرزِ زندگی میں قدامت پسند اور دین دار تھے، لیکن ان کی معاشی اور تجارتی نگاہیں عالمی منڈیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

ان کاروباری حلقوں کی یورپ میں گہری دلچسپی اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنی اسلامی شناخت چھوڑ کر ثقافتی طور پر یورپی بننا چاہتے تھے، بلکہ اس لیے تھی کہ یورپ ان کے لیے اپنی مصنوعات بیچنے کی ایک بہت بڑی اور منافع بخش منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ان نئے ابھرتے ہوئے صنعتی اور مینوفیکچرنگ مراکز نے ایردوان اور ان کی جماعت کو کاروباری متوسط طبقہ کی حمایت فراہم کی، جس سے ترکیہ کی ماضی کی روایتی اسلامی تحریکیں ہمیشہ محروم رہی تھیں۔

ترکیہ کی سرحدوں سے باہر، ایردوان کے پورے منصوبے کو ایک سیکولر آبادی پر زبردستی قدامت پسند اسلام مسلط کرنے کے ایجنڈے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ زمینی حقیقت اس سے مختلف ہے۔

یہ سچ ہے کہ مذہبی اور باحجاب شہریوں کو ریاستی اور عوامی اداروں میں اپنی مذہبی شناخت کو چھپائے بغیر اور اپنے عقیدے پر شرمندہ ہوئے بغیر سر اٹھا کر جینے اور کام کرنے کا بنیادی حق مل گیا، مگر جوان علامتوں کو نہیں مانتے ہیں یا ساحل سمندر یا دیگر جگہوں پر برائے نام کپڑے پہنے ہوں، ان پر بھی کوئی قدغن نہیں ہے۔ نائٹ کلب ہو یا کیسینو یا شراب خانے، ان پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔

اسٹیفن کنزر نے اپنی تحریروں میں معروف ترک صحافی فہمی کورو کی اہلیہ کی عبرت انگیز کہانی بیان کی ہے۔ امریکا کے معروف تعلیمی ادارے میساچوسٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں وہ سر پر اسکارف پہن کر مکمل آزادی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی تھیں اور امتحانات کے دوران ان کے مذہبی اوقات کا احترام بھی کیا جاتا تھا۔

لیکن اسی خاتون کو خود ان کے اپنے وطن ترکیہ میں محض اسکارف پہننے کے جرم میں کسی بھی اسکول یا یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دینے سے روک دیا گیا تھا۔ سابق صدر عبداللہ گل کی اہلیہ کو بھی یونیورسٹی کے امتحانات میں محض اسکارف کی وجہ سے داخلے سے روک دیا گیا تھا۔

ایردوان نے برسوں کی خاموش اور آئینی جدوجہد کے بعد ان تمام امتیازی پابندیوں کو مرحلہ وار ختم کر دیا۔ ان کے حامی ان اقدامات کو اسلامائزیشن کے بجائے حقیقی جمہوری اور بنیادی انسانی حقوق کی بحالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملک بھر میں تاریخی مساجد کی شاندار تزئین و آرائش کی گئی اور نئی خوبصورت مساجد تعمیر کی گئیں، لیکن کسی بھی شہری کو ان مساجد میں داخل ہونے یا نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔

امام حاطب اسکولوں کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا، ان کے نصاب کو سائنسی و عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا گیا اور ان کا دائرہ وسیع کیا گیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ روایتی سیکولر اسکول بھی پہلے کی طرح مکمل آزادی کے ساتھ چلتے رہے۔

خود ایردوان امام حاطب اسکول کے فارغ التحصیل ہیں اور انہوں نے اپنے تمام بچوں کو بھی انہی مدرسوں میں پڑھایا۔ جیسے جیسے سیاست دانوں، اعلیٰ بیوروکریٹس، ڈاکٹرز، انجینئرز اور بااثر کاروباری خاندانوں کے بچے اور بچیاں ان امام حاطب اسکولوں میں داخل ہونے لگیں، وہ قومی دھارے اور مرکزی عوامی شناخت کا حصہ بنتے چلے گئے۔ ان کا معیار اعلیٰ ہوتا گیا۔

اس اصلاحات کا معاشرتی اور نفسیاتی اثر انتہائی گہرا اور دیرپا تھا۔ ترکیہ کے مذہبی اور قدامت پسند شہریوں میں احساس کمتری ختم ہو گیا اور ان کو احساس ہو گیا کہ جدید دور میں معاشی و علمی ترقی کرنے کے لیے انہیں اپنی اسلامی شناخت، اقدار اور دینی شعار کو قربان نہیں کرنا پڑے گا۔

اسی نوعیت کی ایک اور حیران کن اور تاریخی تبدیلی اس شعبے میں رونما ہوئی جو روایتی طور پر پرانی سیکولر اسٹیبلشمنٹ اور فوج کا سب سے مضبوط اور ناگزیر گڑھ مانا جاتا تھا۔ دہائیوں تک ترک مسلح افواج اپنے بنیادی ہتھیاروں، طیاروں اور گولہ بارود کے لیے مکمل طور پر امریکا اور مغربی یورپی ممالک کی محتاج اور ان کے اسلحے پر منحصر رہیں۔ ۲۰۰۰ء کی دہائی کے آغاز میں ترکیہ اپنی کل دفاعی ضروریات کا بہ مشکل بیس فیصد حصہ مقامی طور پر تیار کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ۲۰۲۴ء تک یہ مقامی پیداواری شرح شاندار ترقی کے ساتھ ۸۰ فیصد سے بھی تجاوز کر گئی۔

دفاعی اور ایرواسپیس مصنوعات کی برآمدات، جو ۲۰۰۲ء میں محض ۲۴۸ ملین ڈالر تھیں، سال ۲۰۲۴ء میں زبردست اضافے کے ساتھ ۱ء۷/ارب ڈالر تک جا پہنچیں اور سال ۲۰۲۵ء میں اس نے دس ارب پچاس ملین ڈالر کی حد عبور کی۔ ساڑھے تین ہزار سے زیادہ جدید دفاعی کمپنیوں میں ایک لاکھ سے زائد اعلیٰ تربیت یافتہ ترک انجینئرز اور تکنیکی ماہرین روزگار پا رہے ہیں۔

ترکیہ آج دنیا بھر میں جدید مسلح ڈرونز اور بغیر پائلٹ کے جنگی طیاروں کا سب سے بڑا اور سب سے معتبر برآمد کنندہ بن چکا ہے۔ ملک اپنا پانچویں نسل کا اسٹیلتھ لڑاکا طیارہ ’قاآن‘ کامیابی کے ساتھ تیار کر رہا ہے۔ مہمت اوزترک کے مطابق ان اقدامات سے ایردوان نے فوج میں خاصا اثر و رسوخ قائم کیا۔ کئی جرنیلوں نے کہا کہ جب فوج کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہیں، تو اس کو سیاست میں مداخلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اپنی جدید تاریخ کے طویل عرصے تک انقرہ کی نظریں ہمہ وقت اور غیر متزلزل طور پر صرف مغرب، واشنگٹن اور برسلز کی جانب ہی لگی رہتی تھیں۔ آق پارٹی نے ابتدائی برسوں میں اس مغربی سمت کو ترک نہیں کیا۔ مگر اس دوران ترکیہ نے اپنے سفارتی نقشے کو دنیا کے دیگر براعظموں تک وسعت دینا شروع کر دی۔

براعظم افریقا، وسطی ایشیا کی برادر ترک ریاستیں، بلقان کا تاریخی خطہ اور مشرقِ وسطیٰ ترک سفارت کاری کے سب سے متحرک اور اہم ترین میدان بن گئے۔ بعد میں ترکیہ نے پورے براعظم ایشیا کے ساتھ اپنے تجارتی، سفارتی اور ثقافتی تعلقات کو نئی گہرائی دینے کے لیے اپنے تاریخی ’ایشیا انیو‘ منصوبے کا باقاعدہ آغاز کیا۔

ترکیہ کے پاس آج دنیا بھر میں ۲۶۲ مکمل فعال سفارتی مشنز اور سفارت خانے موجود ہیں، جس کے نتیجے میں ترکیہ اب دنیا کا تیسرا سب سے بڑا سفارتی نیٹ ورک رکھنے والا ملک بن چکا ہے۔ اس نئی سفارتی حکمتِ عملی کی سب سے

تابناک اور واضح مثال براعظم افریقا ہے۔ ۲۰۰۰ء کی دہائی کے آغاز میں پورے براعظم افریقا میں ترکیہ کے پاس صرف بارہ سفارت خانے موجود تھے۔ آج یہ تعداد بڑھ کر ۴۴ مکمل فعال سفارت خانوں تک جا پہنچی ہے۔

ترکیہ کے عالمی سفارتی و اخلاقی اثر ورسوخ کو قائم کرنے میں ترکش کوآپریشن اینڈ کوآرڈینیشن ایجنسی یعنی ٹیکا ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق اس نے دنیا کے ایک سو ستر سے زائد ممالک میں تیس ہزار سے زیادہ فلاحی، تعلیمی اور بنیادی ڈھانچے کے منصوبے اور سرگرمیاں کامیابی سے مکمل کی ہیں۔ ترکیہ اپنی معیشت کے حجم کے تناسب کے لحاظ سے دنیا میں سب سے زیادہ انسانی اور ترقیاتی امداد دینے والے ممالک کی صفِ اول میں بار بار پہلے یا دوسرے نمبر پر شمار ہوتا رہا ہے۔

تاہم، آق پارٹی کی اس غیر معمولی پچیس سالہ شاندار کامیابی کی کوکھ میں ایک گہرا تضاد اور مضمر چیلنج بھی چھپا ہوا ہے۔ اس جماعت کی جو سب سے بڑی تزویراتی اور سیاسی طاقت رہی ہے، وہی رفتہ رفتہ اس کی سب سے بڑی تنظیمی اور ساختی کمزوری بھی بن چکی ہے اور وہ ذات خود رجب طیب ایردوان ہیں۔

اس جماعت نے اپنے سفر کے دوران بے شمار باصلاحیت، مقبول اور قدآور رہنماؤں کو جنم دیا، جن میں عبداللہ گل، بلند ارنچ، احمد داؤد اوغلو، علی باباجان، بن علی یلدرم اور دیگر کئی نمایاں نام شامل تھے۔

ان میں سے کچھ رفقاء اختلافات کے باعث جماعت چھوڑ گئے، کچھ کو وقت کے ساتھ تنظیمی طور پر سائیڈ لائن کر دیا گیا، جبکہ بعض نے اپنی الگ سیاسی جماعتیں بنا لیں۔ لیکن ان تمام قدآور رہنماؤں میں سے کوئی ایک بھی عوام کے اندر اپنے بل بوتے پر وہ آزادانہ اور کرشماتی انتخابی سحر اور سیاسی اتھارٹی قائم نہ کر سکا جس کی مثال ایردوان کی ذات میں دکھائی دیتی ہے۔

پچیس سالہ دورِ اقتدار کے اس پورے تاریخی حساب کتاب کو صرف موٹرویز، شاندار اسپتالوں، ناقابلِ تسخیر ڈرونز اور پے در پے انتخابی فتوحات کی فہرست پر ہی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

جس جمہوری جدوجہد اور آئینی تبدیلی نے فوج کے غیر آئینی تسلط اور سیاسی سرپرستی کو ہمیشہ کے لیے جڑ سے اکھاڑ پھینکا، اسی نے آج ترکیہ کے سامنے ایک نیا اور پیچیدہ سوال کھڑا کر دیا ہے۔ کیا ترکیہ نے ماضی کے غیر منتخب فوجی جرنیلوں کے بے پناہ اختیارات سے نجات پا کر اب ان کی جگہ منتخب سویلین قیادت کو بے پناہ اور مرتکز اختیارات تو نہیں سونپ دیے ہیں؟

اسٹیفن کنزر نے برسوں پہلے اس ابھرتے ہوئے سنگین سیاسی تضاد کی نشاندہی کر دی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ترکیہ نے ایک ایسے بوسیدہ نظام سے تو کامیابی سے نجات حاصل کر لی جہاں کمزور، منقسم اور بدعنوان سیاسی دھڑوں کو خاکی وردی پوش جرنیل اپنی انگلیوں پر نچاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ایسے نئے ابھرتے ہوئے نظام سے بھی متنبہ کیا تھا جہاں تمام ریاستی اختیارات ایک ہی سیاسی جماعت اور ایک ہی مضبوط شخصیت کے گرد سمٹتے چلے جا رہے تھے۔

حالیہ برسوں میں عوام کو بے لگام افراطِ زر، ترک لیرا کی قدر میں مسلسل کمی اور روزمرہ زندگی کے ہوشربا اخراجات کے ایک تلخ اور اعصاب شکن معاشی بوجھ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ معاشی بحران اس لیے زیادہ تشویشناک اور سنگین ہے کیونکہ آق پارٹی کا ترکیہ کے عوام کی اکثریت کے ساتھ مضبوط اور فیصلہ کن رشتہ نظریاتی کے بجائے بے مثال انتظامی صلاحیت، گورننس اور مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رہی ہے۔

مارچ ۲۰۲۴ء کے بلدیاتی انتخابات نے اس بدلتی ہوئی عوامی لہر اور معاشی اضطراب کی سب سے واضح اور سنجیدہ وارننگ دی تھی۔ ملک کی تاریخ میں بائیس سال بعد پہلی بار روایتی حزبِ اختلاف کی جماعت ریپبلکن پیپلز پارٹی یعنی سی ایچ پی قومی سطح پر بلدیاتی ووٹوں کے لحاظ سے پہلے نمبر پر آ گئی۔ استنبول اور انقرہ میں اپوزیشن کے میئر منتخب ہو گئے۔ گو کہ حال ہی میں اپوزیشن سی ایچ پی کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں، مگر معاشی صورت حال سے تنگ عوام اس کا دامن تھام سکتے ہیں اور وہ موثر اتحاد بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ سوال ہے کہ سویلین حقوق کی طویل لڑائیوں کے دوران عوام کی جو بے پایاں وفاداری اور عقیدت آق پارٹی کو حاصل ہوئی تھی، اس عظیم سیاسی ورثے کو ایردوان کے بعد کون سنبھالے گا؟ وہ کون سا ایسا رہنما ہو گا جو بیک وقت اناطولیہ کے ایک چھوٹے دکاندار، استنبول کے جدید کاروباری بلڈر، بحیرہ اسود کے مذہبی قدامت پسند اور وسطی اناطولیہ کے سخت گیر قوم پرست ووٹر کے دل کو چھو سکے اور ان سب کو ایک ہی پلیٹ فارم پر متحد رکھ سکے گا؟ آق پارٹی کے پاس فی الحال ان بنیادی اور وجودی سوالات کا کوئی واضح اور حتمی جواب موجود نہیں ہے۔

اس تمام تر بحث کے باوجود، آج کا جدید ترکیہ اس بکھرے ہوئے اور لاچار ملک سے دور دور تک کوئی مشابہت نہیں رکھتا جو ۲۰۰۲ء میں اس جماعت کو ورثے میں ملا تھا۔

یہ تمام تر تبدیلیاں کوئی سطحی، عارضی یا نمائشی تبدیلیاں نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت جدید ترک ریاست کے وجود اور اس کے کردار کی ایک مکمل، ہمہ جہت اور تاریخی کایا پلٹ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نظام کے سنگین اندرونی، جمہوری اور ادارہ جاتی نقصانات سے بھی آنکھیں چرانا ناممکن ہے۔

ایک چوتھائی صدی قبل، رجب طیب ایردوان نے اپنی قوم سے یہ تاریخی وعدہ کیا تھا کہ اب ترکیہ میں کبھی بھی کچھ پہلے جیسا نہیں رہے گا۔ اور گزشتہ پچیس برسوں میں واقعی بہت کچھ یکسر بدل گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس نے ایک ایسی پائیدار، مستحکم اور بااصول سیاسی تحریک بھی تعمیر کر لی ہے جو کل کو ایردوان کے بعد بھی اپنی بقا، وحدت اور طاقت کو برقرار رکھ سکے؟

بلاشبہ یہ سوال اس پورے تاریخی دور کا سب سے کڑا، آخری اور فیصلہ کن امتحان ثابت ہو گا۔

(بحوالہ: ’’دی وائر اردو ڈاٹ کام‘‘۔ ۱۹/اگست ۲۰۲۶ء)

* * *

بقیہ: مکہ معاہدہ: امکانات اور خدشات

توقع ہے کہ مکہ معاہدہ میں عربوں سمیت دیگر مسلم ممالک کو بھی شامل کیا جائے گا۔ اگر یہ اتحاد کامیاب رہا تو سوال یہ نہیں ہو گا کہ ان تینوں ملکوں نے اتحاد کیوں قائم کیا بلکہ یہ ہو گا کہ اپنے مختلف النوع مفادات کے باوجود یہ ممالک علاقائی سطح پر سلامتی کا ایسا ڈھانچا تشکیل دینے میں کیونکر کامیاب ہوئے جس کے اصول اور قواعد بیرونی قوتوں کی مرضی کے مطابق طے نہیں ہوئے بلکہ اُنہوں نے خود طے کیے ہیں۔

میرے خیال میں یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر اسٹریٹجی اور بین الاقوامی سیاست کے اسکالرز، تجزیہ کاروں اور محققین کو متوجہ ہونا چاہیے۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Mecca agreement: Why Saudi Arabia, Turkey and Pakistan teamed up".
("middleeasteye.net". August 19, 2026)

* * *

مَکّہ مُعاہدہ، اِمکانات اور خَدشات

Ahmed Altuwaijri

بہت سوں کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ میں گزشتہ ماہ سعودی عرب، پاکستان اور ترکی نے جس مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ پر دستخط کیے ہیں، وہ ایک خاص مسئلے پر ریاض کے ردِعمل کا نتیجہ تھا۔ ایسا نہیں ہے۔

بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مکہ معاہدہ پر دستخط کرنے والے تینوں ملکوں کے اپنے اپنے اسٹریٹجک مفادات کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی نے اس معاہدے یا سمجھوتے کی راہ ہموار کی ہے۔ تینوں کی جائے وقوع الگ ہے، طاقت کے ذرائع الگ ہیں، خطرات اور چیلنج بھی الگ ہیں مگر پھر بھی کوئی چیز ہے جو اِنہیں آپس میں جوڑتی ہے۔

تینوں ملکوں کو شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ ایک زمانے سے مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مغربی ایشیا کو چلانے والا سلامتی کا نظام اب کارگر نہیں رہا بلکہ ختم ہی ہو چکا ہے۔ یہ نظام اب پہلی سی سلامتی کا ضامن ثابت نہیں ہوسکتا۔

تین علاقائی قوتوں کو غیر معمولی یا انفرادی نوعیت کی خصوصیات ایک پلیٹ فارم پر لائی ہیں۔ سعودی عرب تیل کی دولت سے بھی مالا مال ہے اور دینی مرکز بھی ہے۔ اُس کی جیو پولیٹیکل پوزیشن بھی غیر معمولی ہے۔ ترکی مضبوط فوج رکھتا ہے اور اُس کی ڈیفنس انڈسٹریز بھی غیر معمولی نوعیت کی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کا محلِ وقوع بھی منفرد نوعیت کا ہے۔ وہ مشرقِ وسطیٰ کو یورپ، بحیرۂ اسود اور مشرقی بحیرۂ روم سے جوڑتا ہے۔ اور پاکستان بھی فطری علوم وفنون میں عمومی سطح پر اور دفاعی ساز وسامان کی تیاری سے متعلق تحقیق اور مہارت میں خصوصی طور پر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اُس کی فوج بھی طاقتور ہے۔ وہ جوہری اسلحے سے بھی لیس ہے اور جنوبی ایشیا میں اُس کی اسٹریٹجک گہرائی بھی ہے۔

مکہ معاہدہ کو خطے کی سلامتی سے متعلق نظریے اور فلسفے کی تبدیلی کے آغاز کے طور پر لیا جانا چاہیے۔ یہ خطہ صرف ایک طاقت یعنی امریکا پر انحصار پذیر رہا ہے۔ اب معاملات بدل چکے ہیں۔ علاقائی سطح پر نئی اسٹریٹجک رفاقتیں واقع ہورہی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ بلند سطح کا ڈیٹرنس (ردِجارحیت) تیار کیا جاسکے۔ مکہ معاہدہ میں کہا گیا ہے کہ تینوں میں سے کسی بھی ملک پر حملہ باقی دو پر بھی حملہ تصور کیا جائے گا۔ اور یوں تینوں ملک مل کر ایک دوسرے کا دفاع یقینی بنائیں گے۔ تینوں ملکوں کا کہنا ہے کہ یہ معاہدہ دفاعی نوعیت کا ہے یعنی کسی پر حملے کی نیت سے تشکیل نہیں دیا گیا۔ اِس کا ہدف کوئی بھی ملک نہیں۔

سوال یہ نہیں ہے کہ یہ تینوں ملک کس ملک یا کن ممالک کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ اس موقع ہی پر اِنہیں ایک دوسرے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ہے۔

سعودی عرب کا اثر ورسوخ

فطری طور پر سعودی عرب ہی وہ ملک ہے جس کا مکہ معاہدہ کے حوالے سے بہت زیادہ ذکر کیا جارہا ہے۔ خیر، سعودی عرب کی سلامتی کو صرف ایک خاص تناظر میں دیکھنا غلطی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ سعودی عرب کو ایک انتہائی منفرد اور انتہائی پیچیدہ اسٹریٹجک ماحول کا سامنا ہے۔ وہ خطے کے قلب میں واقع ہے۔ اس مقام پر بہت سے بین الاقوامی اور علاقائی منصوبے اور طاقتیں ایک دوسرے سے ہوکر گزرتی ہیں۔

سوال صرف سعودی عرب کی سرحدوں کو تحفظ فراہم کرنے کا نہیں بلک وہ خلیجِ فارس، بحیرہ احمر، باب المندب، توانائی کے راستوں، انتہائی اہم بنیادی ڈھانچے، فضائی حدود، سائبر سکیورٹی، سپلائی چین، بڑے معاشی منصوبوں اور دوسرے بہت سے معاملات پر بھی محیط ہونا چاہتا ہے۔ یہ سب کچھ پاکستان اور ترکی سے دفاعی نوعیت کے اشتراکِ عمل کو غیر معمولی اہمیت سے نوازتا ہے۔ ترکی اعلیٰ درجے کی عسکری، صنعتی اور ٹیکنالوجیکل صلاحیتوں اور مہارت کی فراہمی کا ذریعہ ہے جبکہ پاکستان غیر معمولی عسکری گہرائی، آپریشنل تجربے اور سعودی عرب سے طویل المیعاد دفاعی تعلقات کا حامل رہا ہے۔

سعودی عرب غیر معمولی دینی اور سیاسی اثر و رسوخ کا حامل ہے۔ اُس کے معاشی ذرائع غیر معمولی ہیں۔ اُس میں دفاعی صنعتوں میں غیر معمولی سرمایہ کاری کی بھرپور صلاحیت و سکت پائی جاتی ہے۔ وہ مختلف اشیا کی منڈیوں، توانائی اور بنیادی ڈھانچے میں بھی بھرپور سرمایہ کاری کرسکتا ہے۔ اگر مکہ معاہدہ کو سمجھنا ہے تو سعودی عرب کی اہلیت اور رضامندی کو بھی سمجھنا ہوگا کہ وہ کہاں کہاں کیا کرنا چاہتا ہے، کتنی سرمایہ کاری کا خواہش مند ہے۔

مکہ معاہدہ کے حوالے سے کسی بھی ملک کے بارے میں کوئی تشویشناک بات نہیں کہی جاسکتی۔ سعودی عرب اور ایران کے تعلقات حالیہ برسوں میں بہت اچھے رہے ہیں۔ کشیدگی کا گراف نیچے لانے کے لیے رابطے بڑھائے گئے ہیں۔ ایسے میں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ سعودی عرب کی طرف سے مکہ معاہدہ کو ایران سے نئی محاذ آرائی شروع کرنے کے لیے استعمال کرنا محض حماقت ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ سعودی عرب اب تمام علاقائی اور عالمی طاقتوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اُس پر حملہ کرنے کی قیمت محض اُس پر حملہ کرنے کی قیمت نہیں ہوگی بلکہ حملہ کرنے والوں کو مثالی نوعیت کی دفاعی اہلیت کے حامل بہت بڑے نیٹ ورک اور اتحادوں کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا۔

یہی اِس ڈیٹرنس کا عرق ہے۔ سعودی عرب کسی بھی قیمت پر جنگ نہیں چاہتا۔ وہ تو جنگ کو ٹھیک ٹھاک مہنگا معاملہ بنانا چاہتا ہے تاکہ کوئی بھی حریف حملہ کرنے سے قبل اچھی طرح سوچ لے کہ اِس کا انجام کیا ہوسکتا ہے۔

ترک خارجہ پالیسی

ایسے میں کوئی سوچ سکتا ہے کہ انقرہ کو بھلا اسلام آباد اور ریاض سے دفاعی معاہدے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ ترکی معاہدۂ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم نیٹو کا رکن ہے اور اِس اتحاد میں وہ ایک بڑی، مضبوط اور باصلاحیت فوج رکھتا ہے۔ اُس کی دفاعی صنعت بھی بہت تیزی سے پنپ رہی ہے۔

ترکی نے حالیہ چند برسوں میں اپنی خارجہ پالیسی کو غیر معمولی حد تک تبدیل کیا ہے۔ وہ اپنے محلِ وقوع کو سلامتی سے متعلق مفادات کے تناظر میں دیکھتا ہے اور بدلتی ہوئی صورتِ حال کے مطابق خود کو بدلنے کے لیے تیار کر رہا ہے۔ شام، عراق، لبنان، لیبیا، مشرقی بحیرۂ روم، بحیرۂ اسود، کاکیشیا، روس، ایران اور یورپ سے اپنے تعلقات پر وہ نظرثانی کر رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ حقیقت پسند خارجہ پالیسی وضع کی جاسکے۔

یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ شام میں ترکی نے بھی ایک خاص کردار ادا کیا ہے۔ وہ اسرائیلی پالیسیوں کا ناقد بھی رہا ہے، بالخصوص غزہ کی صورتِ حال کے حوالے سے۔ یہی سبب ہے کہ اسرائیل سے اُس کے تعلقات میں کشیدگی در آئی ہے۔

چند ماہ کے دوران رونما ہونے والی ایک خاص بات یہ ہے کہ ترکی اور اسرائیل کے تعلقات میں پیدا ہونے والی کشیدگی محض فلسطین کے مسئلے پر سیاسی نوعیت کی نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان اسٹریٹجک سطح پر تصادم ہوا ہے، بالخصوص شام اور مشرقی بحیرۂ روم کے حوالے سے۔

اسرائیل نے یونان اور قبرص کے ساتھ عسکری اور اسٹریٹجک تعلقات کو گہرا کرنے پر خاص توجہ دی ہے۔ اِن تینوں ممالک نے حال ہی میں اپنی دسویں سربراہ کانفرنس منعقد کی ہے۔ یونان، اسرائیل اور قبرص نے آپس میں دفاعی تعلقات کو بھی وسعت دی ہے اور معاملات مشترکہ فوجی مشقوں تک جا پہنچے ہیں۔

ترکی کے نقطۂ نظر سے یہ حقیقت کسی بھی حال میں نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ اسرائیل، یونان اور قبرص ایک ایسے خطے میں عسکری اور سیاسی اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کر رہے ہیں جس میں ترکی سے اُن کے مفادات کا براہِ راست اور غیر معمولی تصادم ہوسکتا ہے۔

یہ سب کچھ ذہن میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ ترکی کے لیے پاکستان اور سعودی عرب کی طرف اسٹریٹجک پارٹنرشپ کے لیے دستِ تعاون بڑھانا کیوں ناگزیر اور سُودمند ہے۔ ترکی اپنی اسٹریٹجک صلاحیتوں کو صرف امریکا، یورپ اور نیٹو تک محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ ایسا وسیع تر نیٹ ورک چاہتا ہے جس میں کسی بھی حریف یا حریفوں کے اتحاد کے لیے وہ ہدف پذیر نہ رہے، کوئی بھی اُسے تر نوالہ نہ سمجھے۔

بہت سے حوالوں سے کیے جانے والے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے اور سمجھی بھی جاسکتی ہے کہ سعودی عرب اور پاکستان سے ترکی کا یہ دفاعی معاہدہ راتوں رات پیدا نہیں ہوگیا۔ پاکستان اور سعودی عرب کے ساتھ اِس مساوات میں ترکی میں کی شمولیت اُس نیٹ ورک کو مزید مضبوط کرتی ہے جو عشروں سے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔

پاکستان کے اندازے

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، مکہ معاہدہ میں اُس کی شمولیت کو محض مشرقِ وسطیٰ کے تناظر میں دیکھنا ایک بڑی غلطی سمجھا جائے گا۔ پاکستان جب سے قائم ہوا ہے تب سے اُس کی سلامتی کے لیے بھارت کی طرف سے خطرات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جب پاکستان اور بھارت عمومی سطح پر پُرامن ہوتے ہیں تب بھی مسئلہ کشمیر، سرحدی تنازعات اور دونوں جوہری طاقتوں کے درمیان عسکری سطح پر مسابقت جاری ہی رہتی ہے۔ اور اِس کے نتیجے میں دونوں کا اسٹریٹجک توازن مسلسل متاثر رہتا ہے۔

گزشتہ برس پاکستان اور بھارت کے درمیان اچانک کشیدگی غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی۔ دونوں میں شدید نوعیت کی فضائیں جھڑپیں بھی ہوئیں۔ عسکری تحرک بھی پیدا ہوا اور براہِ راست تصادم نے معاملات کو نازک مقام پر پہنچا دیا۔ پاکستان مکہ معاہدہ کو محض خلیجِ فارس کے عدسے سے نہیں دیکھتا۔ پاکستان یہ دیکھ رہا ہے کہ وہ کس طور مختلف محاذوں پر درپیش چیلنجوں سے نپٹنے کے لیے مکہ معاہدہ کو عمدگی سے بروئے کار لاسکتا ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ریاض بہت اہم پارٹنر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ سعودی عرب محض خلیجِ فارس یا عرب دنیا کا ملک ہی نہیں بلکہ معاشی قابلیت، توانائی، دین اور سیاست کا مرکز بھی ہے۔ اور یہ حیثیت محض علاقائی نہیں بلکہ عالمی بھی ہے۔

ترکی غیر معمولی عسکری اہلیت کا حامل ہے۔ اُس کی دفاعی صنعت بھی بہت اچھی پوزیشن میں ہے۔ ڈرون انڈسٹری میں بھی ترکی نے غیر معمولی پیش رفت ممکن بنائی ہے۔ وسطِ ایشیا، مشرقِ وسطیٰ، یورپ، روس اور چین سے اُس کے تعلقات وسیع اور گہرے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ امریکا سے بھی بہت اچھے تعلقات کا حامل ہے۔ ایسے میں یہ سہ فریقی معاہدہ پاکستان کو بھی وسیع تر اسٹریٹجک گہرائی فراہم کرتا ہے۔

اس بات کی وضاحت کردینا لازم ہے کہ سعودی عرب کو کسی بیرونی فوج کی ضرورت نہیں۔ ہاں، وہ اپنے لیے طاقت یقینی بنانے کے ذرائع میں تنوع ضرور چاہتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ سعودی حکومت ریاست اور اُس کی حدود کا دفاع کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ حالیہ عشروں میں سعودی حکومت نے مسلح افواج کو زیادہ سے زیادہ صلاحیت کی حامل بنانے کے لیے غیر معمولی وسائل صرف کیے ہیں۔ سعودی فوج کے پاس معیاری ایئر فورس ہے، میزائل ڈیفنس سسٹم ہے اور بحریہ بھی باصلاحیت اور پیشہ ورانہ مہارت کی حامل ہے۔

جدید عسکری قوت محض اس بات کا نام نہیں ہے کہ جدید ترین ہتھیار زیادہ سے زیادہ خرید لیے جائیں۔ اب بھرپور تربیت، آپریشنل تجربہ، خفیہ معلومات کے حصول کی صلاحیت، کمانڈ اور کنٹرول، مصنوعی سیاروں کی کارکردگی، مصنوعی ذہانت سے مستفید ہونے کی صلاحیت، الیکٹرانک آلاتِ جنگ، جنگی ساز و سامان تیار کرنے کی صلاحیت، اُن کی دیکھ بھال اور کسی طویل جنگ میں عسکری کارروائیوں کا تسلسل یقینی بنانے کی صلاحیت سبھی کچھ شامل ہے۔ پاکستان اور ترکی سے اسٹریٹجک پارٹنرشپ سعودی عرب کو محض جارحیت کے وقت مضبوط بنائے رکھنے کے ساتھ ساتھ طویل المیعاد بنیاد پر غیر معمولی خودمختاری کے ساتھ قومی سطح کا ڈیٹرنس تیار کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ اچھا دفاعی اتحاد محض اس لیے نہیں ہوتا کہ کوئی ملک اپنے پارٹنرز ہی پر منحصر رہے بلکہ اس کا بنیادی مقصد اُس ملک کو اپنے موثر دفاع کے لیے زیادہ سے زیادہ تیاری کی حالت میں رہنے کے قابل بنانا ہے۔

وسیع نیٹ ورک

مکہ معاہدہ کو غیر معمولی جغرافیے نے وہ اہمیت عطا کی ہے جو عام طور پر روایتی نوعیت کے دفاعی معاہدوں اور اتحادوں کو حاصل نہیں ہوا کرتی۔ ترکی اس خطے کے انتہائی شمالی حصے میں واقع ہے۔ وہ یورپ سے سٹا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بحیرہ اسود اور مشرقِ وسطیٰ سے بھی جُڑا ہوا ہے۔ سعودی عرب اس خطے کے قلب میں واقع ہے۔ وہ خلیجِ فارس اور بحیرہ احمر کے درمیان ہے۔ پاکستان کا محلِ وقوع یہ ہے کہ وہ ایران کے مشرق میں ہونے کے ساتھ ساتھ بھارت اور وسطِ ایشیا سے بھی سٹا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بحیرۂ عرب کا بھی اہم جُز ہے۔

پاکستان، سعودی عرب اور ترکی مل کر ایک ایسا تکون ترتیب دیتے ہیں جو اناطولیہ، جزیرہ نما عرب اور جنوبی ایشیا پر محیط ہے۔ یہ تمام حقائق مل کر مکہ معاہدہ کو ایسی وسعت اور گہرائی عطا کرتے ہیں جو محض قومی سرحدوں کو تحفظ فراہم کرنے کے معاملے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مکہ معاہدہ تین خطوں (مشرقی بحیرۂ روم، خلیجِ فارس اور بحرِ ہند) کو جوڑ رہا ہے، ایک دوسرے میں پیوست کررہا ہے۔

یہ تینوں خطے پہلے ہی توانائی، بین الاقوامی تجارت اور تجارتی مال کے لیے سمندری راہداریوں پر مشتمل ہیں۔ ایسے میں ترکی کا تحفظ سعودی عرب کی سلامتی سے جُڑا ہوا ہے۔ اور پاکستان کی سلامتی بھی کوئی الگ تھلگ معاملہ نہیں ہے۔ یہ اسٹریٹجک اور معاشی مفادات کا وسیع نیٹ ورک ہے۔

پاکستان، ترکی اور سعودی عرب کو ایک لڑی میں پرونے والی ایک بنیادی حقیقت یہ بھی ہے کہ تینوں ملکوں کو اسٹریٹجک بحری راہداریوں تک وسیع رسائی حاصل ہے۔ تینوں کی سمندری حدود غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ ترکی بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کو جوڑنے والے سمندری راستوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ سعودی عرب خلیجِ فارس اور بحیرۂ احمر کا نگران ہے جبکہ پاکستان بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند کو جوڑنے والے راستے پر واقع ہے۔

یہ تمام حقائق سمندری سفر کے تحفظ کے ساتھ ساتھ بحری اور انٹیلی جنس کی سطح پر اشتراکِ عمل کو فطری اشتراکِ عمل میں تبدیل کرتے ہیں۔ باب المندب اور آبنائے ہرمز کو متاثر کرنے والے حالیہ واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو تجارت اور خام تیل (اور گیس) کی ترسیل کے راستوں کو تحفظ

فراہم کرنا اب بحری سطح پر غیر معمولی اسٹریٹجک اہمیت کے حامل ممالک کی قومی سلامتی کے معاملات میں بنیادی نکتے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مکہ معاہدہ مستقبل میں سمندروں کی نگرانی، ڈرون حملوں کی روک تھام، جہاز رانی کے تحفظ، بندرگاہوں کی سائبر سکیورٹی، بحری قوتوں کی انٹیلی جنس، بارودی سرنگوں کے تدارک، ساحلوں کے بنیادی ڈھانچے، تلاش اور امداد سے متعلق سرگرمیوں کا معیار بلند کرنے میں غیر معمولی کردار کا حامل ہوسکتا ہے۔ یہ تمام معاملات محض حالتِ جنگ سے کہیں بڑھ کر قدرے حالتِ امن میں بھی وسیع البنیادی تعاون اور اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

ایک اور اہم معاملہ دفاعی سازوسامان کی صنعت کا ہے۔ ترکی کا شمار اب ڈرون، غیر انسانی سسٹمز، میزائل، جنگی جہاز، آرمرڈ وہیکلز اور عسکری سطح کی الیکٹرانکس تیار کرنے والے نمایاں ملکوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان بھی دفاعی صنعت کے حوالے سے وسیع تجربے کے ساتھ ساتھ وسیع آپریشنل مہارت کا بھی حامل ہے۔

سعودی عرب نے حالیہ برسوں میں اپنے ہاں دفاعی صنعت کو پروان چڑھانے پر خاصی توجہ دی ہے۔ سعودی عرب کو توانائی اور سرمایہ کاری کی بہت بڑی مارکیٹ کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ وہ اپنی دفاعی صنعت کے ایک بڑے حصے کو مقامی حیثیت دینے کی بھی تیاری کر رہا ہے۔

دفاعی ہم آہنگی

مکہ معاہدہ رفتہ رفتہ محض دفاعی ڈیل سے کہیں آگے جاکر دفاعی معاملات میں ایک وسیع تر فریم ورک کی شکل بھی اختیار کرسکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو سعودی عرب، پاکستان اور ترکی کی دفاعی صلاحیت میں غیر معمولی اضافہ ممکن بنایا جاسکے گا۔ یوں علاقائی سطح پر دفاعی صنعتوں کو باہم مربوط بنا کر اسلحے کی ایک بڑی مارکیٹ کھڑی کی جاسکے گی، بالخصوص مسلم دنیا میں۔

پاکستان کی جوہری صلاحیت مکہ معاہدہ کا ایک انتہائی اہم اور حساس جُز ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سعودی عرب اور ترکی کو جوہری ڈیٹرنس کی چھتری تلے لائے جاسکیں گے اور اِس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ پاکستان کے جوہری اثاثے مکہ معاہدہ کا باضابطہ حصہ ہیں۔

جوہری ہتھیاروں کے حامل کسی بھی ملک کا کسی بھی عسکری معاہدے یا اتحاد میں ہونا ڈیٹرنس کی نوعیت کو فیصلہ کن حد تک تبدیل کردیتا ہے۔ ایسے اتحاد کا کوئی بھی مخالف یا حریف صرف میدانِ جنگ میں تعینات کی جانے والی فوج کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ اُس کی نظر معاہدے میں شریک جوہری صلاحیت والے ملک کی مجموعی طاقت پر بھی ہوتی ہے۔ ایسے کسی بھی معاہدے کے فریق غیر معمولی اسٹریٹجک گہرائی کے حامل ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھیے تو مکہ معاہدہ میں پاکستان کا ہونا اِس اتحاد کے کسی بھی حریف کو وسیع البنیاد جنگ شروع کرنے سے قبل دس بار سوچنے پر مجبور ضرور کرے گا۔

ساتھ ہی ساتھ یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ مکہ معاہدہ کے ذریعے ترکی، سعودی عرب اور پاکستان نے اپنے سابق اتحادوں اور اسٹریٹجک تعلقات کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ سعودی عرب اب بھی خلیجی مجلسِ تعاون (جی سی سی) کا اہم حصہ ہے۔ وہ عرب لیگ اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) کا بھی رکن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ امریکا اور یورپ سے وسیع تعلقات کا بھی حامل ہے۔ ترکی نیٹو کے ساتھ ساتھ او آئی سی کا بھی رکن ہے۔ پاکستان بھی او آئی سی کا رکن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ امریکا، چین اور یورپ سے طویل، پیچیدہ اسٹریٹجک تعلقات کا بھی حامل ہے۔ ایسے میں مکہ معاہدہ کو آپشنز میں نمایاں اور وسیع البنیادی تنوع پیدا کرنے والے فیکٹر کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مکہ معاہدہ کے فریق اپنے اپنے سابق اتحادوں اور اسٹریٹجک تعلقات سے دست بردار یا کنارا کش ہو رہے ہیں۔

یہ پالیسی اور حکمتِ عملی آج کی دنیا میں تیزی سے اور وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ ریاستوں کو لازمی طور پر واشنگٹن، بیجنگ اور ماسکو کے درمیان انتخاب نہیں کرنا۔ وہ اِن تینوں سے تعلقات رکھتے ہوئے متناسب اور متوازن طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اِسے ‘‘اسٹریٹجک ہیجنگ’’ کہا جاسکتا ہے۔ کسی واحد سمت کا غلام ہوکر محدود ہوجانے کے بجائے بڑی طاقتوں سے تعلقات میں توازن قائم رکھنا ہی اب بیشتر ریاستوں کی بنیادی پالیسی اور حکمتِ عملی ہے۔

حقیقی آزمائش

سابق اسٹریٹجک اتحادوں کے برعکس مکہ معاہدہ کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ تینوں ارکان کے درمیان پائی جانے والی مماثلت پر نہیں بلکہ اُن کے درمیان پائے جانے والے فرق کی بنیاد پر قائم ہے۔

مکہ معاہدہ کے تینوں ارکان میں سے ہر ایک کے ایران، بھارت، اسرائیل، امریکا، روس اور چین سے انفرادی نوعیت کے تعلقات ہیں، مختلف النوع مفادات وابستہ ہیں۔ پھر بھی اِن کے درمیان اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے کہ اِن کے بہت سے معاملات ایک دوسرے سے گہرا ربط رکھتے ہیں اور اُس کی بنیاد پر ایک وسیع البنیاد دفاعی معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اپنے آپ میں بہت اہم ہے کہ ریاستوں کو کوئی بڑا اتحاد قائم کرنے کے لیے تمام معاملات میں مکمل اتفاقِ رائے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چند ایک معاملات میں بھی اگر اُن کے مفادات یکساں ہوں تو یہ بھی اس بات کے لیے بہت ہے کہ وہ تنہا نہ چلیں بلکہ مل جل کر اپنے لیے کوئی مشترکہ راستہ تلاش کریں۔

یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ مکہ معاہدہ کی حقیقی آزمائش اُس وقت شروع ہوگی جب اِس پر پوری توجہ اور قوت کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ تمام ہی دفاعی اتحاد دستخط والے دن تو بہت اچھے اور طاقتور لگتے ہیں مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ محض کاغذ کے پُرزے سے طاقت پیدا نہیں ہوتی۔

مکہ معاہدہ کی کامیابی کا مدار چند عملی نوعیت کے سوالوں پر ہے جن کے جواب ملنے کی صورت میں صورتِ حال واضح ہوتی چلی جائے گی۔ پھر بھی یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ مکہ معاہدہ سے کہیں زیادہ اہم اِس کی پشت پر کام کرنے والا آئیڈیا ہے۔ اگر مکہ معاہدہ مکمل عسکری اتحاد میں تبدیل نہ بھی ہو تو ایک بنیادی مقصد تو اِس کے ذریعے حاصل کرلیا گیا ہے۔ علاقائی سلامتی یقینی بنانے کی سوچ اب بڑی طاقتوں کی مرہونِ منت نہیں رہی۔ علاقائی ریاستیں مل کر بھی سلامتی کے معاملات کو نئی شکل دے سکتی ہیں۔

مکہ معاہدہ عسکری اتحاد سے پہلے فکر و نظر کی سطح پر رونما ہونے والی ایک بڑی اور نمایاں تبدیلی بھی ہے۔ عشروں تک مشرقِ وسطیٰ میں سلامتی کا نقشہ بیرونی قوتوں کا تیار کردہ ہوا کرتا تھا۔ اب علاقائی ریاستیں اِس حوالے سے خود بھی بہت کچھ کرنے کی خواہش مند دکھائی دے رہی ہیں۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مکہ معاہدہ نے ایک بڑے سیاسی زلزلے کی راہ ہموار کی ہے جس کے جھٹکے رفتہ رفتہ سامنے آرہے ہیں، بڑھ رہے ہیں۔ دنیا بھر کے انتہائی وقیع تحقیقی مراکز نے اِسے موضوعِ تحقیق و بحث بنایا ہے۔ بیشتر تحقیقی مراکز اس نکتے پر متفق ہیں کہ مکہ معاہدہ نے مشرقِ وسطیٰ میں سلامتی اور سلامتی کی بنیاد بننے والے اتحادوں کی تشکیل کے حوالے سے معاملات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

علامتی اہمیت

مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے خصوصی تحقیق و تجزیہ کرنے والے معروف امریکی تھنک ٹینک دی کاؤنسل آن فارن

ریلیشنز نے حال ہی میں اپنے جریدے کے سرِ ورق پر "The U.S.-Led Middle East Order Is Over. The Mecca Agreement Proves It." کے زیرِ عنوان تجزیے میں لکھا ہے کہ مکہ معاہدہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی اثر و رسوخ نمایاں حد تک ختم ہو چکا ہے۔ علاقائی قوتیں سلامتی یقینی بنانے کا نظام خود ہی تشکیل دے رہی ہیں اور اِس معاملے میں اپنے وسائل اور مہارت پر زیادہ انحصار کر رہی ہیں۔

آسٹریلیا کے لووی انسٹیٹیوٹ نے اسٹریٹجک معاملات کی محقق سائرہ بانو کا ایک تجزیہ شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مکہ معاہدہ بحرِ ہند اور بحرالکاہل کے خطے کے مغربی کنارے کی نئی توضیح کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ تجزیے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مکہ معاہدہ پر دستخط سے بھارت کو فوری اور سیاسی سطح پر حساس مضمرات کا سامنا ہوگا۔

دی یروشلم انسٹیٹیوٹ فار اسٹریٹیجی اینڈ سکیورٹی نے لکھا ہے کہ تین فریقوں پر مشتمل یہ دفاعی اتحاد غیر معمولی چیلنج کھڑے کرتا ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں سلامتی سے متعلق مغربی سوچ کے حامل ایسے ڈھانچے کے لیے حدود و قیود پیدا کرتا ہے جس میں اسرائیل کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔

مکہ معاہدہ کے ذریعے سعودی عرب نے یہ پیغام دیا ہے کہ وہ کسی ملک سے جنگ تو نہیں چاہتا مگر اپنی سلامتی کے معاملے کو غیر یقینی صورتِ حال کے رحم و کرم پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ یہ تبدیلی سفارت کاری، کشیدگی میں کمی اور مختلف طاقتوں سے بامقصد تعلقات استوار رکھنے کی وسیع تر سعودی پالیسی سے ہم آہنگ ہے۔

سفارت کاری ڈیٹرنس سے متصادم نہیں ہوتی۔ کامیاب اور مضبوط ترین سفارت کاری یہ ہے کہ اُس فریقین کا استحکامِ فکر و نظر نمایاں ہو اور ہر فریق یہ محسوس کرے کہ بات چیت کسی کمزوری کا نتیجہ نہیں۔ ایسے میں مکہ معاہدہ کو اعلانِ جنگ سے کہیں بڑھ کر جنگوں کی روک تھام کے لیے کی جانے والی سرمایہ کاری کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ اور اِسے مجموعی طور پر پورے خطے کے لیے سلامتی اور استحکام کی ضمانت سمجھا جانا چاہیے۔

مکہ معاہدہ کے لیے مکہ مکرمہ کا انتخاب بھی غیر معمولی سیاسی اور علامتی اہمیت کا حامل ہے۔ مکہ محض ایک شہر نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ مکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے اتحاد و یگانگت کی واضح ترین علامت ہے۔

\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۹ /////

تہذیبوں کا تصادم اور جان ایسپوزیٹو کی تنبیہ

عبداللہ العریان

۱۵؍جولائی کو، جب امریکی بم ایران پر برس رہے تھے، اسی روز معروف امریکی عالمِ اسلامیات جان ایسپوزیٹو کا انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنی پوری علمی زندگی اس بات کی تنبیہ کرتے ہوئے گزاری کہ اسلام کو ایک خطرے کے طور پر دیکھنے اور پیش کرنے کا رویہ بالآخر خود اس خطرے کو حقیقت میں بدلنے کا سبب بن سکتا ہے۔

۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب کے وقت اسلام کے چند محدود امریکی ماہرین میں ایسپوزیٹو بھی شامل تھے۔ چنانچہ تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے خطے میں رونما ہونے والے واقعات کی اہمیت اور ان کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے امریکی عوام کے سامنے ان واقعات کی وضاحت کرنے کے لیے بار ہا ان سے رجوع کیا جاتا رہا۔

اگرچہ وقت کے ساتھ اس شعبے میں درجنوں ایسے ماہرین اور تجزیہ نگار سامنے آئے جو اس علمی خلا کو پُر کرنے اور پالیسی کے لیے سفارشات پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ایسپوزیٹو اپنی جگہ منفرد رہے۔ ان کی انفرادیت کی بنیادی وجہ مسلم دنیا کے لوگوں کے ساتھ ان کا گہرا تعلق اور ہمدردی و باہمی تفہیم کو فروغ دینے کا ان کا پختہ عزم تھا۔

۱۵؍جولائی کو ان کے انتقال کے بعد جب ان کے دوست، رفقائے کار اور سابق طلبہ ان کے غم میں جمع ہوئے تو انہوں نے ایسی زندگی کو یاد کیا جو ایک واضح مقصد، علم و حقیقت سے غیر متزلزل وابستگی اور تعصب و جہالت کے مقابلے میں مسلسل جدوجہد سے عبارت تھی۔

ابتدا میں ایسپوزیٹو نے کیتھولک مدرسے میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا، لیکن انہوں نے ایک نسبتاً غیر معروف راستہ اختیار کیا اور ایسے وقت میں اسلام کے مطالعے کو اپنا خصوصی میدان بنایا جب اسلام اور دنیا بھر میں اس کے اُس وقت کے پچاس کروڑ سے کچھ زیادہ پیروکاروں کے بارے میں زیادہ تر امریکی عوام کے ذہن میں کوئی خاص دلچسپی موجود نہیں تھی۔

ایسپوزیٹو اکثر اپنے استاد، معروف عالم اسماعیل الفاروقی، کے کردار کا ذکر کیا کرتے تھے۔ الفاروقی نے مختلف ثقافتوں اور مذہبی روایات کے درمیان تفہیم کا راستہ اختیار کرنے میں ان کی بنیادی رہنمائی کی۔ الفاروقی خود صہیونی منصوبے کے نتیجے میں فلسطین سے جلاوطنی کا سامنا کر چکے تھے۔ وہ امریکا منتقل ہوئے، جہاں انہوں نے The Historical Atlas of the Religions of the World (۱۹۷۴ء) جیسی بنیادی علمی تصانیف پیش کیں اور اسلامائزیشن آف نالج کے اہم علمی منصوبے کی بنیاد رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ایسپوزیٹو نے اپنے علمی سفر کا آغاز ایسے دور میں کیا جب امریکی فیصلہ ساز اور عام عوام اب بھی دنیا کو سرد جنگ کے تناظر سے دیکھتے تھے۔

ایرانی انقلاب نے اس تصور کو چکنا چور کر دیا۔ اس نے یہ واضح کر دیا کہ عالمی سیاست اب صرف کئی دہائیوں سے جاری سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کشمکش سے متعین نہیں ہوگی، بلکہ مذہب بھی عالمی معاملات میں ایک اہم کردار ادا کرے گا، حالاں کہ اس سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ جدید دنیا میں مذہب کو عالمی امور کے حاشیے پر پہنچا دیا گیا ہے۔ ایسپوزیٹو کے علمی سفر کے ابتدائی دور ہی سے ان کے کام میں یہ بات نمایاں رہی کہ وہ ان بنیادی روحانی عقائد کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے جو سماجی تحریکوں اور سیاسی منصوبوں کو متحرک کرتے ہیں۔

امریکا بھر میں مختلف اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ سیاسی تقسیم اور تنازعات کی جڑوں کو سمجھنے کے لیے سطحی توضیحات سے آگے بڑھنا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک مختلف فریقوں کے درمیان پُل قائم کرنے کے لیے ان گہری اقدار اور اعتقادات کو سمجھنا ناگزیر تھا جو لوگوں کے رویوں کو تشکیل دیتے ہیں اور جن کی بنیاد میں بہت سے تنازعات پوشیدہ ہوتے ہیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکی خارجہ پالیسی کے حلقے مسلم دنیا کے ساتھ ایک ممکنہ تصادم کے تصور میں پہلے سے زیادہ مبتلا ہوتے گئے۔ اس رجحان کو بعض ایسے اہلِ علم کی آرا سے بھی تقویت ملی، جن میں سیموئل ہنٹنگٹن اور برنارڈ لیوس شامل تھے، جو مغرب اور مسلم دنیا کے درمیان ایک ناگزیر تہذیبی تصادم کے خدشے کا اظہار کر رہے تھے۔

اپنی کتاب The Islamic Threat میں ایسپوزیٹو نے اس طرزِ فکر کو مسترد کیا۔ انہوں نے قارئین کو سطحی تصورات اور تصادم کے تصور سے آگے بڑھ کر ان بنیادی اسباب کو سمجھنے کی

دعوت دی جو ایسے بیانیوں کو تقویت فراہم کرتے ہیں۔

ایک ایسے وقت میں جب میں خود ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور امریکا میں مسلمانوں کے لیے بڑھتی ہوئی بے یقینی اور عدم تحفظ کے ماحول میں جوان ہو رہا تھا، اس کتاب نے مجھے یہ سمجھنے میں مدد دی کہ اس بحث میں اصل داؤ پر کیا لگا ہوا ہے، اور یہ کہ ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ ایسے غالب تصورِ فکر کو چیلنج کریں جو ہمارے ملک اور دنیا بھر میں مذہبی برادریوں کے احترام اور سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔

تنہائی میں بلند ہونے والی ایک آواز

۱۱ر ستمبر کے واقعات کے بعد اور عالمی سطح پر ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے اعلان کے ساتھ یہ سوال پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو گیا۔ امریکا نے دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر مسلم دنیا میں اپنی طاقت اور اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے غیر معمولی وسائل بروئے کار لائے، لیکن ایسپوزیٹو ایسے ماحول میں بھی ایک ایسی آواز بنے رہے جو غالب رجحان کے برخلاف احتیاط اور حقیقت پسندی کی طرف توجہ دلاتی تھی۔ وہ فیصلہ سازوں پر زور دیتے رہے کہ وہ ایسے نظریاتی مغالطّوں سے بچیں جو بالآخر مزید تشدد اور تباہی کا راستہ ہموار کر سکتے ہیں۔

افغانستان اور عراق کی طویل جنگیں، بڑے پیمانے پر نگرانی، ڈرون حملے، لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کر کے حراست میں رکھنا اور تشدد و اذیت جیسے طریقے جب ۲۱ویں صدی کی پہلی دہائی میں امریکی پالیسی کا مستقل حصہ بن گئے تو ایسپوزیٹو اس چیلنج کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ تھے، لیکن انہوں نے مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا۔

اس وقت تک وہ ایک تجربہ کار تجزیہ نگار بن چکے تھے۔ انہوں نے اپنے طلبہ کی غیر معمولی حوصلہ افزائی اور رہنمائی جاری رکھی، مسلم دنیا کے مختلف حصوں سے اٹھنے والی تنقیدی آوازوں کو نمایاں کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور پہلے سے بھی زیادہ علمی کام پیش کیا۔

انہوں نے Oxford Encyclopedia of the Islamic World جیسے اہم علمی ماخذ فراہم کیے اور Unholy War اور Who Speaks for Islam? جیسی کتابیں تصنیف کیں۔ مؤخر الذکر ایک وسیع اور اعداد و شمار پر مبنی مطالعہ تھا جس میں ۳۵ سے زیادہ مسلم اکثریتی ممالک کے عوامی رجحانات کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔

۲۰۱۰ء کے اواخر میں جب عرب خطے میں آمرانہ حکومتوں کے خلاف عوامی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایسپوزیٹو ان اہلِ علم میں شامل تھے جو اس صورتِ حال کا انتہائی ضروری تاریخی پس منظر اور متوازن تجزیہ پیش کرنے کی بہترین پوزیشن میں تھے۔ اس وقت صحافیوں اور پالیسی سازوں کے لیے یہ سوال ایک نئی نسل کے سامنے اہم بن چکا تھا کہ اسلام اور جمہوریت باہم ہم آہنگ ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

ایسپوزیٹو نے اس موقع کا غیر معمولی امید کے ساتھ خیر مقدم کیا، تاہم انہوں نے صبر اور احتیاط کی ضرورت پر بھی زور دیا، کیونکہ وہ ان اندرونی اور بیرونی دباؤ سے بخوبی واقف تھے جن کا ان جمہوری امکانات کو سامنا ہونا تھا۔

اسلام کے بہت سے ماہرین کے برعکس ایسپوزیٹو کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ صرف متون کے مطالعے تک محدود نہیں رہتے تھے، بلکہ مسلمانوں کے حقیقی اور عملی تجربات کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح وہ مستشرقانہ طرزِ مطالعہ کے اس جال سے بچتے رہے جس میں مسلمانوں کو صرف متون کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کی عملی زندگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل کے عام ہونے سے بہت پہلے ہی ایسپوزیٹو مختلف علاقوں کا سفر کرتے اور ہر طبقے کے لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ مراکش سے انڈونیشیا تک انہوں نے سربراہانِ مملکت، اعلیٰ مذہبی علما، تحریکوں کے قائدین اور نوجوان کارکنوں سمیت مختلف طبقات سے گفتگو کی۔

عرب بغاوتوں کے پُرجوش دور میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی کا Center for Muslim-Christian Understanding، جس کے بانی ڈائریکٹر ایسپوزیٹو تھے، کانفرنسوں، ورکشاپس، پالیسی بریفنگز اور خصوصی لیکچرز کی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔

ہر پروگرام میں ایسپوزیٹو ایک حقیقی عوامی دانش ور کے طور پر اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک تجزیہ نگار اور محقق کی ذمہ داری صرف اس کی علمی تحقیق اور تحریروں تک محدود نہیں ہوتی۔ ان کی خوش مزاجی اور گفتگو میں نمایاں ہمدردی انہیں سامعین سے غیر معمولی طور پر جوڑ دیتی تھی۔

جب وہ اپنے بے شمار واقعات میں سے کوئی واقعہ سناتے یا کسی تازہ خبر پر گفتگو کرتے تو ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی اور وہ اپنے سامنے موجود پوری طرح متوجہ سامعین کے چہروں کو دیکھتے۔ اپنے اخلاقی اصولوں کو عملی زندگی میں بروئے کار لاتے ہوئے ایسپوزیٹو ان لوگوں کے ساتھ کھڑے ہونے سے کبھی نہیں ہچکچائے جو اپنے عقائد اور نظریات کی قیمت ادا کر رہے تھے۔

انہوں نے انور ابراہیم، جو آج ملائیشیا کے وزیر اعظم ہیں، کی اس وقت حمایت کی جب وہ ملائیشیا کی حکومت کی جانب سے عائد کیے گئے جھوٹے الزامات کے تحت قید تھے۔

انہوں نے امریکا میں قید سیاسی قیدیوں کے حق میں بھی آواز اٹھائی، جن میں Holy Land Five کے افراد بھی شامل تھے۔ یہ افراد اس تنظیم کے عہدیدار تھے جو کبھی امریکا کی سب سے بڑی مسلم فلاحی تنظیم تھی اور جنہیں ۲۰۰۸ء میں دہشت گردی کی مالی معاونت کے الزامات میں سزا سنائی گئی تھی۔

انہوں نے میرے والد سامی العریان کے معاملے میں بھی آواز اٹھائی۔ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور ایسپوزیٹو کے ساتھ متعدد علمی منصوبوں میں شریک رہے تھے، لیکن ۱۱ر ستمبر کے بعد دہشت گردی سے متعلق ایک ایسے مقدمے میں گرفتار کر لیے گئے جو بالآخر ناکام ثابت ہوا۔ حالیہ عرصے میں بھی ایسپوزیٹو راشد الغنوشی کے معاملے کو اجاگر کر رہے تھے۔ ۸۵ سالہ عالم، دانش ور اور النہضہ پارٹی کے رہنما غنوشی کو تیونس کے حکام نے ملک میں وسیع پیمانے پر جاری جمہوریت مخالف کریک ڈاؤن کے بعد قید کر رکھا ہے۔

اپنی پوری علمی زندگی میں ایسپوزیٹو فلسطینی عوام کی مشکلات کو بھی مسلسل اجاگر کرتے رہے۔ وہ فلسطین کے مسئلے کو اسلامی دنیا اور مغرب کے درمیان تصور کیے جانے والے تنازعے کی ایک بنیادی سبب سمجھتے تھے۔ اسلاموفوبیا کے بارے میں اپنی وسیع تحقیق میں انہوں نے فلسطینیوں کی مسلسل غیر انسانی تصویر کشی اور ان کے انسانی وقار سے انکار کو ایک اہم مسئلہ قرار دیا اور انصاف کے حصول کے لیے اس صورتِ حال کو درست کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس مؤقف کی وجہ سے انہیں اپنے پورے علمی سفر کے دوران اسرائیل کے سخت ترین حامی حلقوں کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ قبل جب ایسپوزیٹو نے پہلی مرتبہ اس ضرورت پر زور دیا تھا کہ مغربی معاشروں کو مسلم معاشروں کے عقائد، اقدار اور عملی زندگی کے بارے میں زیادہ بہتر معلومات حاصل کرنی چاہییں تاکہ تنازعات سے بچا جا سکے اور باہمی تفہیم کو فروغ دیا جا سکے، آج اسی کے بعد امریکا نے ایران کے خلاف ایسی جنگ چھیڑی ہے جس نے بڑے پیمانے پر تباہی اور عدم استحکام پیدا کیا ہے اور جس کے اثرات آنے والے کئی برسوں تک محسوس کیے جانے کا امکان ہے۔

\\\\\\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۴ /////

بھارت کی نئی اُلجھن

ہرش وی پنت

مکہ میں ۷؍اگست کو پاکستان، ترکی اور سعودی عرب کے درمیان طے پانے والا دی مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کے نتیجے میں مغربی ایشیا (مشرقِ وسطیٰ) میں اسٹریٹجک معاملات تبدیل ہوگئے ہیں۔ مکہ معاہدہ کے تحت یہ طے پایا ہے کہ کسی ایک فریق پر کیا جانے والا حملہ باقی تمام فریقوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس معاہدے کے تحت فریقین انٹیلی جنس شیئرنگ بڑھائیں گے، مشترکہ جنگی مشقیں کریں گے، عسکری تربیت کی توسیع کریں گے اور دفاعی صنعت کو فروغ دینے کے حوالے سے اشتراکِ عمل اور تعاون کو فروغ دیں گے۔

بھارت کے لیے بھی مکہ معاہدہ بہت اہم ہے اور اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اِس کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہ معاہدہ بھارت کو ہدف بناتے ہوئے طے پایا ہے بلکہ بھارت کی پریشانی کا اصل سبب یہ ہے کہ اِس دفاعی معاہدے کے نتیجے میں پاکستان کی پوزیشن مضبوط ہوگی اور مشرقِ وسطیٰ میں سلامتی کے ڈھانچے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے تناظر میں یہ ایسا معاملہ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ بھارت کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ اِس بات کو یقینی بنائے کہ مکہ معاہدہ کے نتیجے میں خلیجِ فارس کے خطے میں اُس کے معاشی مفادات کو نقصان نہیں پہنچے اور توسیع پاتی ہوئی اسٹریٹجک پارٹنرشپس کی اہمیت نہ گھٹے۔

مکہ معاہدہ کو مشرقِ وسطیٰ کی سلامتی کے حوالے سے امریکا کے گھٹتے ہوئے کردار اور خطے میں تیزی سے پنپتے ہوئے عدمِ استحکام کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ پورے خطے میں اِس وقت غیر یقینی پائی جاتی ہے۔ ایران کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا نے اسرائیل کے ساتھ مل کر جو کچھ بھی کیا، اُس کی ناکامی، ایران اور اُس کی پروردہ ملیشیا کے ہاتھوں خلیجی ممالک کے بنیادی ڈھانچے اور بحری راستوں پر حملوں اور آبنائے ہرمز اور بحیرۂ احمر کی صورتِ حال سے متعلق تشویش نے خطے میں پائی جانے والی سکیورٹی ارینجمنٹس کی کمزوری اور ہدف پذیری نمایاں کردی ہے۔

مکہ معاہدہ کے فریقین کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ یہ تمام خصوصیات ایک پلیٹ فارم پر لاکر مجموعی تاثیر کو بڑھایا جارہا ہے۔ سعودی عرب مالیاتی اعتبار سے مستحکم ملک ہے۔ اُس کے پاس غیر معمولی زر ہے۔ توانائی سے متعلق امور میں بھی اُس کی پوزیشن بہت اچھی ہے۔ وہ توانائی کی عالمی مارکیٹ میں اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی تبدیلی یقینی بنا سکتا ہے۔ ترکی غیر معمولی اسٹریٹجک ویلیو کا حامل ملک ہے۔ وہ ایشیا کو یورپ سے ملاتا ہے۔ آبنائے باسفورس کی اہمیت ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ معاہدۂ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کا رکن ہے۔ یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ ترکی میں دفاعی صنعت بہت تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے۔ اُس نے ڈرون ٹیکنالوجی میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ترکی میں پنپنے والی دفاعی ساز و سامان کی صنعت ایک معقول مارکیٹ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پاکستان کا معاملہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ روایتی ہتھیاروں کے حوالے سے مستحکم ہے اور اُس کے پاس جوہری ڈیٹرنس بھی ہے اور یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھی جانی چاہیے کہ وہ خلیجی مجلسِ تعاون کے ارکان کو عسکری تربیت فراہم کرتا رہا ہے اور اشتراکِ عمل یقینی بناتا رہا ہے۔

پاکستان، سعودی عرب اور ترکی کی یہ تمام خصوصیات مل کر مکہ معاہدہ کی اسٹریٹجک ویلیو میں اس قدر اضافہ کرتی ہیں جسے ہلکا نہیں لیا جاسکتا۔ سعودی عرب غیر معمولی سطح پر سرمایہ کاری کرسکتا ہے۔ اُس کے پاس زرِ مبادلہ کے وافر ذخائر ہیں جن کی مدد سے وہ ترکی میں دفاعی صنعت کو قابلِ رشک حد تک پروان چڑھا سکتا ہے۔ پاکستان عسکری سطح پر افرادی قوت بھی فراہم کرسکتا ہے اور تربیت کے معاملات میں بھی اُس کی افادیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عسکری امور میں غیر معمولی نوعیت کی مہارت کے ذریعے بھی پاکستان مکہ معاہدہ کے باقی دونوں فریقوں کے لیے متعدد معاملات میں آسانی کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔ نیٹو کی طرز کا کوئی عسکری ڈھانچا تیار کیے بغیر بھی یہ معاہدہ آگے چل کر تینوں ارکان کے درمیان سکیورٹی کے معاملات میں غیر معمولی نوعیت کی پارٹنرشپ اور اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کرسکتا ہے اور اِس کے نتیجے میں تینوں کے لیے اسٹریٹجک معاملات میں گہرائی پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے۔

بھارت کے لیے بنیادی سوال یہ نہیں ہے کہ یہ دفاعی معاہدہ ”سُنّی نیٹو“ ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ پاکستان کے لیے اسٹریٹجک معاملات میں مزید گہرائی پیدا کرنے کی گنجائش پیدا کرسکتا ہے یا نہیں۔

یہ بات واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے کہ پاکستان کو مکہ معاہدہ سے بہت کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔ اس معاہدے کا فریق ہونے کے نتیجے میں پاکستان خلیجِ فارس کے خطے میں سلامتی کے کسی بھی نئے ڈھانچے میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے اور اُسے زیادہ کُھل کر اپنا عسکری کردار ادا کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ یہ پلیٹ فارم اُسے محض جنوبی ایشیا کی عسکری قوت کی سطح تک نہیں رہنے دے گا بلکہ اُسے کچھ کر دکھانے کی وسعت عطا کرے گا۔

مکہ معاہدہ کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ سعودی عرب یا ترکی کسی بھی نئے پاک بھارت تصادم یا مسلح تنازع میں اچانک مداخلت کر بیٹھیں گے۔ تینوں ملکوں کے حقیقی مفادات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ایسے میں کسی بھی ملک کے لیے فوری مداخلت کی گنجائش برائے نام ہی ہے۔ سعودی عرب اور بھارت کے درمیان غیر معمولی معاشی تعلقات ہیں۔ سعودی حکومت بھارت سے بہت کچھ خریدتی ہے اور لاکھوں بھارتی باشندے سعودی عرب میں کام کرتے ہیں۔ ایسے میں سعودی عرب کے پاس اِس بات کی گنجائش کم ہے کہ وہ راتوں رات کوئی ایسا ویسا فیصلہ کرکے اِن تعلقات کے لیے مسائل پیدا کرے۔ ترکی کے لیے بھی معاملات پیچیدہ ہیں۔ وہ تنِ تنہا بہت کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اُس کا محلِ وقوع موافق ہے مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس پر کوئی ذمہ داری ہی عائد نہیں ہوتی۔ اُسے ایران، یورپ، خلیجِ فارس اور جنوبی ایشیا سے اپنے تعلقات متوازن رکھنے ہیں۔

مکہ معاہدہ کے نتیجے میں رونما ہونے والی ممکنہ اور حقیقی سیاسی تبدیلیوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ بیرونی ذرائع سے حاصل ہونے والی مدد پاکستان کے لیے سفارتی سطح پر بھی بہت کچھ کرنے کی گنجائش پیدا کرسکتی ہے اور بھارت سے کشیدگی کی شکل میں پیدا ہونے والے بحرانوں سے نمٹنے میں پاکستان کے لیے مختلف اقدامات کی زیادہ گنجائش بھی نکل سکتی ہے۔ اگر عسکری مداخلت کی زیادہ گنجائش پیدا نہ ہوسکے تب بھی سعودی عرب اور ترکی کا بھرپور ساتھ ملنے کی صورت میں پاکستان سیاسی اعتبار سے بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے اور اِس کے نتیجے میں اُسے فائدہ بھی مل سکتا ہے۔ ایسے میں بھارت کو مکہ معاہدہ میں بیان کردہ محض رسمی نوعیت کی کمٹمنٹس پر نظر نہیں

رکھنی چاہیے بلکہ اِس پر بھرپور عمل درآمد کے نتیجے میں دفاعی ٹیکنالوجی، سرمایہ کاری، مالیات اور اداروں کی سطح پر نیٹ ورکنگ کی توسیع کے معاملے کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

سعودی عرب اب بھارت کے لیے ایک اہم ملک بن چکا ہے۔ دونوں ملکوں کے معاشی تعلقات میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وسعت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ حالیہ چند برسوں میں دونوں ملک متعدد معاملات میں ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔ سعودی عرب نے بھارت میں غیر معمولی سرمایہ کاری کی ہے۔ بھارت کو انرجی سکیورٹی کے حوالے سے بھی سعودی عرب سے ترجیحی حمایت درکار ہے۔ تجارت، انسدادِ دہشت گردی اور دیگر بہت سے امور کے ساتھ ساتھ بھارت کو اس بات سے بھی غرض ہے کہ سعودی عرب میں کام کرنے والے بھارتی باشندوں کے لیے کسی بھی طرح کی مشکلات پیدا نہ ہوں۔ بھارت سے تعلقات مستحکم رکھنے کی ضرورت خود سعودی عرب بھی محسوس کرتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ معاشی اعتبار سے بھارت کا وزن زیادہ ہے۔ وہ اہم ملک ہے۔ دوسری طرف بھارت کو سعودی عرب کے ساتھ ساتھ خلیجِ فارس کے ممالک سے بھی متنوع اسٹریٹجی روا رکھنی ہے۔ یہ پورا خطہ بھارت کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

اِس منظرنامے کے تناظر میں یہ بات بہت عجیب اور ناممکن لگتی ہے کہ سعودی عرب مکہ معاہدہ کو پاک بھارت کشیدگی میں اضافے کا ذریعہ بننے کا موقع فراہم کرے۔ قوی امکان اس بات کا ہے اور توقع بھی یہی کی جانی چاہیے کہ سعودی عرب مکہ معاہدہ کو مشرقِ وسطیٰ کی سلامتی یقینی بنانے کے معاملے تک محدود رکھے گا۔ مشرقِ وسطیٰ کے بحری راستوں کا تحفظ یقینی بنانا بھی اِس دفاعی معاہدے کا ایک بنیادی مقصد ہے اور اِسے اگر اِن مقاصد کے حصول تک محدود رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ بھارت کو بھی اِسی حوالے سے کوششیں کرنی چاہئیں تاکہ سعودی عرب سے تعلقات متاثر نہ ہوں اور سعودی قیادت بدگمانی کا شکار نہ ہو۔

بھارت کو ساری توجہ اِس نکتے پر مرکوز رکھنی چاہیے کہ سعودی عرب سے اُس کے تعلقات نہ صرف یہ کہ نہ بگڑیں بلکہ یہ بہتر ہوں اور مزید گہرائی پیدا ہو تاکہ خلیجِ فارس کی سلامتی کے حوالے سے پاکستان کا بڑھتا ہوا کردار بھارت کی پوزیشن میں خرابی کی راہ ہموار نہ کرے۔ بھارت کو سعودی عرب سے دفاع، انسدادِ دہشت گردی، بحری سلامتی، سرمایہ کاری اور توانائی کے شعبوں میں اشتراکِ عمل بڑھانے پر متوجہ رہنا چاہیے۔ بھارت کو اس بات کے لیے کوشاں رہنا چاہیے کہ پاکستان سے اُس کی کشیدگی سعودی عرب سے اُس کے تعلقات پر اثرانداز نہ ہو۔

بھارت کو یہ بھی سمجھنا اور محسوس کرنا چاہیے کہ خلیجِ فارس کی سلامتی کے حوالے سے پاکستان کا بڑھتا ہوا کردار دراصل اسٹرکچر کی سطح پر ممکن بنائی جانے والی پیشرفت ہے۔ خلیجِ فارس بھارت کے لیے محض توانائی کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک اہم تجارتی روٹ بھی ہے۔ وہاں بھارتی باشندے بہت بڑی تعداد میں کام کر رہے ہیں۔ سرمایہ کاری کے بہاؤ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ معاملات بہت حد تک آپس میں جُڑے رہنے کا بھی ہے تاکہ ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوا جاسکے۔

بھارت کو خلیجی ممالک سے دفاعی اور بحری امور میں تعاون اور اشتراکِ عمل کا دائرہ وسیع کرنے پر بھی توجہ دینی چاہیے، بالخصوص انٹیلی جنس، انسدادِ دہشت گردی، سمندری راستوں اور اہم بنیادی ڈھانچے کا تحفظ یقینی بنانے کے معاملے میں۔

بھارت کو ترکی اور سعودی عرب کی طرف سے پاکستان کے لیے ڈیفنس ٹرانسفرز اور فائنانسنگ پر بھی نظر رکھنی چاہیے، بالخصوص ایسے معاملات میں جن سے جنوبی ایشیا میں روایتی عسکری توازن کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔

بھارت کو سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، ایران اور اسرائیل سے اپنے تعلقات متوازن رکھنے پر بھی متوجہ رہنا چاہیے۔ ان تعلقات کو بلاک کی سیاست کے آستانے پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔

بھارت کے پاس ایک اچھا آپشن یہ ہے کہ دفاعی صنعت اور ٹیکنالوجی میں مہارت بڑھائے۔ مکہ معاہدہ کے نتیجے میں مستقبل بعید میں پاکستان، سعودی عرب اور ترکی کے درمیان شاید ایک دوسرے کی جنگ میں شریک ہونا ممکن نہ ہو پائے مگر بہرکیف اِس کا امکان تو موجود ہے کہ سعودی سرمایہ، ترک ٹیکنالوجی اور پاکستانی عسکری صلاحیت مل کر دفاعی صلاحیتیں زیادہ مربوط ہوں گی اور اُن کی مجموعی تاثیر میں اضافہ ہوگا۔

بھارتی قیادت اس مفروضے کی غلامی قبول نہ کرے کہ مکہ معاہدہ بھارت مخالف ہے یا بھارت کو کلیدی طور پر ہدف بنایا گیا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ مشرقِ وسطیٰ میں کوئی نیا فوجی بلاک بنایا جارہا ہے۔ اس کا بنیادی اور کلیدی مقصد فریقین کو مستقبل کے سکیورٹی نظام کے حوالے سے علاقائی عدم استحکام اور غیر یقینیت کے ماحول میں اطمینان اور تیقن فراہم کرنا ہے۔

مکہ معاہدہ بھارت کو اس بات کا ضرور پابند کرتا ہے کہ وہ خلیجِ فارس میں سکیورٹی سے متعلق ماحول کو سنجیدگی سے لے اور چاہے تو خلیجی ممالک سے ابتدائی نوعیت کی ایسی بات کرے جو معاملات کو درست رکھنے میں معاون ثابت ہو۔ بھارت محض تماشائی بنا نہیں رہ سکتا کیونکہ اسلام آباد اور ریاض سے انقرہ کے دفاعی تعلقات علاقائی معاملات میں اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ بھارت کی پوزیشن کمزور بناسکتے ہیں۔ ایسے میں بھارت محض بے نیاز بھی نہیں رہ سکتا کہ محض تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھتا رہے اور وہ غیر ضروری طور پر اشتعال آمیز رَدِعمل کا مظاہرہ بھی نہیں کرسکتا کیونکہ ایسا کرنا اُس کے مفادات کو نقصان پہنچاسکتا ہے۔ بھارت کے پاس صرف یہی ایک معقول راستہ بچا ہے کہ سعودی عرب سے تعلقات بہتر بنائے، خلیجی ریاستوں کو اعتماد میں لے اور پاک ترک دفاعی اشتراکِ عمل پر نظر رکھے۔ اُسے سمندری راستوں کا تحفظ یقینی بنانے کے عمل میں بھی اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بھارتی قیادت کو دفاعی معاملات میں اشتراکِ عمل کا دائرہ وسیع کرنے پر بھی غور کرنا چاہیے۔ مشرقِ وسطیٰ میں مسابقت پذیر فالٹ لائنز ہیں جن سے بھارت بے نیاز بھی نہیں رہ سکتا اور لاتعلق رہنا بھی ممکن نہیں۔ اُسے خطے کے کلیدی ممالک سے اپنے تعلقات متوازن رکھنے پر بھی خاص توجہ دینی ہے۔

مکہ معاہدہ آپریشنل معاملات میں تھوڑا سا محدود بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ہاں، اس معاہدے سے یہ بات ضرور کھل کر سامنے آتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کا سکیورٹی آرکیٹیکچر اب حقیقی معنوں میں علاقائی ہوتا جارہا ہے اور کسی بھی بیرونی قوت کو ضامن کا کردار ادا کرنے کی دعوت دینے سے گریز کیا جارہا ہے۔ بھارت کو صرف اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کی فکر لاحق ہونی چاہیے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

(مضمون نگار ’دی آبزرور ریسرچ فاؤنڈیشن‘ کے نائب صدر ہیں۔)

"The Mecca pact and its implications for India".
("thedailyjagran.com". Aug 17, 2026)

* * *

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی تازہ پیشکش
آزادی، اسلام اور پاکستان
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
قیمت: ۱۰۰ روپے
اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020